تانیثیت کی تاریخ اور روایت سیاسی وسماجی تناظر میں:

رابعہ تبسم ریسرچ اسکالر
جامعہ ملیہ اسلامیہ
نئی دہلی، 110025

ملخص

مؤرخین اس بات سے اتفاق کرتے ہیں کہ یونانی تہذیب دنیا کی قدیم اور ترقی یافتہ تہذیب رہی ہے۔ یونان ایک ایسا ملک ہے جہاں علوم وفنون اور فلسفہ کمال کو پہنچے ہوئے تھے مگر عورتوں کی حالت خستہ تھی وہاں عورتوں کے متعلق یہ قانون بنایا گیا تھا کہ عورت جو بھی کام کرتی اسے باطل قرار دیا جاتا تھا۔ یونانی معاشرہ باوجود ترقی یافتہ ہونے کے وہاں کی عورتیں تعلیم سے بے بہرہ تھیں، ان پر یہ لام تھا کہ وہ اپنے مجازی خدا کی تابعداری کرے۔ مرد جب چاہتا اس کی کم سن بیٹی چھین کر اسے پہاڑوں میں چھوڑ آتا جہاں وہ تنہا چیختے چلاتے مرجاتی مگر ماں کی کوئی حیثیت نہ تھی کہ وہ اپنی کم سن بیٹی کے لیے ایک لفظ کچھ بول سکے۔ جن عورت کو کوئی اولاد نہ ہوتی مرد اس کو طلاق دینے کا پورا اختیار رکھتا تھا۔ یونانی عورتوں کی طرح روم کے عورتوں کی بھی حالت نہایت خستہ تھی پوری طرح خاندان پر مرد کا غلبہ تھا اور عورت کو کوئی حق حاصل نہ تھا۔ رومن قانون کے مطابق مرد عورت کے جسم وجان کا مالک ہوتا تھا۔

تانیثیت کی تاریخ اور روایت سیاسی وسماجی تناظر میں:

عورت اور مرد سماجی تشکیل کے دو اہم جز وہیں، دونوں کے باہمی اشتراک سے سماجی رشتے فروغ پاتے ہیں۔ مرد وعورت کے مشترکہ عمل پر ہی تہذیب وتمدن کا ارتقا منحصر ہے۔ اس عمل کو برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ دونوں متوازی طور پر حصہ داری کریں وگرنہ بنی نوع انسان کی بقا خطرے میں پڑ سکتی ہے۔

جب ابتدا میں انسان غاروں اور جنگلوں میں نیم وحشی زندگی بسر کرتا تھا اس وقت سے ترقی یافتہ دور تک تہذیب وتمدن کی ترقی کسی ایک جنس کی مرہون منت نہیں رہی بلکہ دونوں کی مسلسل کوششیں اور جدوجہد کا نتیجہ ہیں، یوں کہنا بجا نہ ہوگا کہ اس حقیقت سے انکار کی کوئی گنجائش نہیں کہ تہذیب وتمدن کی تشکیل وارتقا میں عورت ومرد دونوں برابر کے شریک ہیں۔

تاریخ گواہ ہے کہ ابتدا میں مادری تہذیب بہت ہی شان وشوکت کے ساتھ رائج تھی۔ عورت ہی گھر، خاندان، قبیلہ کی مالک تھی، فیصلہ سازی کا حق عورت ہی کو حاصل تھا، سلسلۂ نسب بھی اسی سے چلتا تھا، جائیداد وملکیت کی بھی مالک عورت ہی تھی۔ اس وقت لڑکی کی پیدائش کو خوش بختی سمجھا جاتا تھا۔

تہذیب وتمدن کے ارتقائی دور میں جہاں مردوں نے بہت ساری چیزوں کی اختراع عمل میں لائی وہیں بہت ساری چیزوں کی ایجادات عورتوں نے بھی کی۔ جب مردوں نے جانوروں کا شکار کیا تو اسے کھانے کے قابل عورتوں نے ہی بنایا، جانوروں کی کھال سے مفید اور کارآمد چیز عورتوں نے ہی بنائی۔ رہنے کے لیے خیمے اور جھونپڑیاں بنا کر انسان کو غاروں سے باہر نکالا تو وہیں درختوں کے ریشوں سے لباس بنا کر ایک نئی تہذیب کی بناء ڈالی، علاوہ ازیں بوقت ضرورت اس نے شکار بھی کیا اور پوری دل جمعی کے ساتھ میدان جنگ میں بھی کارگزار رہیں۔ نیز زبان کی تشکیل میں بھی اہم کارہائے نمایاں انجام دیا۔ جب مرد شکار کے لیے جنگلوں میں ہوتا تھا تو عورت رہائش کی جگہ پر اپنی اولاد اور دیگر افراد کے ساتھ ساتھ مختلف الفاظ کے لین دین اور اظہار خیال کے ذریعہ زبان کی تشکیل کے ساتھ

ساتھ ترسیل کا بھی کارنامہ انجام دیتی رہیں۔ ذہنی وجسمانی صلاحیتوں میں عورت کسی بھی وجہ سے بھی مرد سے کم تر نہیں تھی۔قدیم تہذیب میں مرد وعورت کو مساویانہ بلکہ بعض معاملات میں مرد سے اعلیٰ مقام حاصل تھا۔

جہاں عورت اپنی صلاحیت اور ہنرمندی سے مختلف شعبۂ حیات میں ترقی کرتی رہی وہیں مرد بھی مختلف شعبوں میں عورت کا ساتھ دینے لگا اور زراعت کے کاموں میں مرد کی دلچسپی اتنی بڑھی کہ وہ اس پر قابض ہوتا چلا گیا۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ عورتوں کے پالے ہوئے جانور جب کھیتوں میں کام کرنے لگے تو مرد اس پر قابض ہوگیا اور زراعت کے تمام امور پر اسی کا غلبہ ہوگیا اور زمینی پیداوار و مویشیوں کو اپنی ملکیت بناڈالی اس طرح دولت جب ایک مرتبہ خاندانوں کی نجی ملکیت بن گئی اور اس میں تیزی سے اضافہ ہونے لگا اس نے مادری حق والے گن پر کاری ضرب لگائی۔ جوں جوں دولت اور طاقت مرد کے پاس بڑھتی گئی ویسے ویسے خاندان اور قبیلے کے اندر عورت کی حیثیت کم سے کم تر ہوتی چلی گئی نیز مرد کے اندر یہ خواہش جنم لینے لگی کہ اس کے مال ودولت کی وارث اس کی اپنی اولاد ہو لہٰذا ایک عورت، ایک مرد اور ان کی اولاد کا تصور عام ہوا تو یک زوجگی نظام کا آغاز ہوا۔ اس نظام کی ابتدا جیسے ہی ہوئی عورت سے بہت سارے حقوق اس نظام نے چھین لیے۔ سب سے پہلے عورتوں کے نام سے نسل کا تسلسل اور ماں سے وراثت پانے کا حق ختم ہوگیا اور مردوں سے نسل کا سلسلہ اور باپ سے وراثت پانے کا حق قائم ہوا۔ اینگلس کے قول کے مطابق ''مادری حق کا خاتمہ عورتوں کی ایک عالمگیر شکست تھی۔''

گھر کے اندر بھی مردوں نے باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی بلکہ عورت کو محض اپنی شہوت کا غلام بنا لیا اور گھر کے باہر بھی مرد ہی کی حکمرانی رہی۔ مال ومویشی، زمین، جائیداد سب پر اسی کا غلبہ ہوگیا اور یہیں سے 'پدرسری' نظام کا آغاز ہوا اور عورت کا مقام نیچے گرادیا گیا۔ اسی دور میں کام کی جنسی تقسیم بھی عمل میں آئی اور عورت کی فطری جسمانی کمزوری کے باعث گھر کا انتظام، بچوں کی پرورش، دیکھ بھال جیسے کام عورت کے منسوب کر دیئے گئے۔ اس تہذیب میں عورت دیویوں کی جگہ پر مرد کو دیوتا بنا کر پوجا جانے لگا اس طرح عورت کی مذہبی حیثیت بھی بالکل ختم ہوکر رہ گئی۔ زبان جب نقطہ اور لکیروں سے آگے بڑھ کر تحریر کی شکل اختیار کی تب تک عورت پورے طریقے سے جہالت کے اندھیرے میں گم ہوچکی تھی چنانچہ تحریر پر بھی مرد کا غلبہ ہوگیا اس طرح مذہب سے لے کر تہذیب وتمدن تک مرد خودمختار وحکمران ہوتا

چلا گیا اور مرد کا رتبہ اتنا بلند ہو گیا کہ لڑکا خاندان کے لیے باعث فخر تصور کیا جانے لگا اور لڑکیاں ناکارہ خاندان اور قبیلہ کے لیے باعث ننگ سمجھی جانے لگیں۔ان کو قتل کرنا یا درگور کرنا کوئی عیب کی بات نہ رہی۔پدرسری تہذیب میں جنگ کی عورتوں کو بندی بنالیا جاتا تھا اور ان کے ساتھ برابر تاؤ کیا جاتا تھا یا تو انہیں باندی بنالیا جاتا یا ان کی خرید وفروخت کی جاتی نتیجہ یہ ہوا کہ دختر کشی کا رواج عام ہو گیا جس کی وجہ سے بعض قبیلوں میں لڑکیوں کی کمی ہونے لگی تو دوسرے قبیلے کی عورتوں اور نوجوان لڑکیوں کو اغوا یا بھگانے جیسی جنسی بیماری پنپنے لگی۔اس طرح معاشرے میں عورت کی کوئی حیثیت باقی نہ رہی،خاندان کے اندر بھی اس کے سارے حقوق چھین لیے گئے۔ان کو کمزور ناقص العقل اور نجس القاب دے کر گھر کے اندر مقید کر دیا گیا اور مذہب وسماج کے نام پر بسیار بندشیں لگادی گئیں اسے اس بات کا ہر طرح سے یقین دلا دیا گیا کہ وہ صرف بچوں کی پیدائش اور مرد کی خدمت کے لیے بنائی گئی ہیں۔

جیسے جیسے تہذیب وتمدن کی ترقی ہوتی گئی ویسے ویسے مختلف اقوام وسماج کا وجود ہوتا گیا۔مختلف ممالک کی قدیم سماج کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ عورت کی محکومیت کی دلخراش داستانیں تقریباً تمام سماج میں یکساں رہی ہیں تاہم استحصال کے طریقے کار جدا جدا رہے۔عورت کی نہ تو کوئی سماجی حیثیت تھی اور نہ ہی معاشی۔دنیا کی ہر قوم نے عورت کے وجود کو نیست نابود کرنے کی سعی کی ہے۔نیاز فتح پوری اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

> ''رومۃ الکبریٰ کے افسانہائے ترقی کس کو نہیں معلوم،لیکن کیا آج ان عورتوں کا شمار کیا جاتا ہے جو راہوں کے ادنیٰ اشارے پر گلیوں میں مکانوں کے اندر،شاہراہوں پر ذبح کر ڈالی گئیں۔عورت ایک لونڈی تھی اور لونڈی سے بھی بدتر ایک جانور،جس کو مارنا اور طرح طرح کی تکلیفیں پہنچانا معمولات زندگی میں داخل تھا پھر مغرب میں ہی نہیں بلکہ مشرق میں بھی ان کے ساتھ جو سلوک کیا گیا وہ ناصیۂ انسانیت کے لیے ایک بدنما داغ ہے جو کسی طرح نہیں مٹ سکتا،شیر خوارگی کے عالم میں ان کو زندہ دفن کیا گیا،ایام حمل میں ان کے پیٹ چاک کیے گئے خانقاہوں اور گرجوں کے تہہ خانے مندروں کی کوٹھریاں ان کی لاشوں سے مدتوں سڑا کیں۔''(اردو ادب میں تانیثیت،مشتاق وانی،ص28)

مؤرخین اس بات سے اتفاق کرتے ہیں کہ یونانی تہذیب دنیا کی قدیم اور ترقی یافتہ تہذیب رہی ہے۔ یونان ایک ایسا ملک ہے جہاں علوم وفنون اور فلسفہ کمال کو پہنچے ہوئے تھے مگر عورتوں کی حالت خستہ تھی وہاں عورتوں کے متعلق یہ قانون بنایا گیا تھا کہ عورت جو بھی کام کرتی اسے باطل قرار دیا جاتا تھا۔ یونانی معاشرہ باوجود ترقی یافتہ ہونے کے وہاں کی عورتیں تعلیم سے بے بہرہ تھیں، ان پر یہ لام تھا کہ وہ اپنے مجازی خدا کی تابعداری کرے۔ مرد جب چاہتا اس کی کم سن بیٹی چھین کر اسے پہاڑوں میں چھوڑ آتا جہاں وہ تنہا چیختے چلاتے مرجاتی مگر ماں کی کوئی حیثیت نہ تھی کہ وہ اپنی کم سن بیٹی کے لیے ایک لفظ کچھ بول سکے۔ جن عورت کو کوئی اولاد نہ ہوتی مرد اس کو طلاق دینے کا پورا اختیار رکھتا تھا۔ یونانی عورتوں کی طرح روم کے عورتوں کی بھی حالت نہایت خستہ تھی پوری طرح خاندان پر مرد کا غلبہ تھا اور عورت کو کوئی حق حاصل نہ تھا۔ رومن قانون کے مطابق مرد عورت کے جسم وجان کا مالک ہوتا تھا۔ شوہر کے مرنے کے بعد عورت کی کوئی اولاد بیٹا یا بیٹی نہ ہونے کی صورت میں دوسرے مرد رشتہ داروں کی وارث تصور کی جاتی۔ باپ کو بھی یہ اختیار حاصل تھا کہ وہ بیٹی کو کہیں بھی فروخت کرسکتا تھا، یہ حق شوہر کو بھی حاصل تھا۔ یہاں عورت جائیداد کی وارث نہ ہوتی بلکہ عورت بذات خود ایک جائیداد تصور کی جاتی روم میں بھی جسم فروشی اپنے عروج پر تھی۔

یورپ کے معاشرہ میں خواتین کی حالت نہایت ہی پست تھی اسے کوئی قانونی حقوق حاصل نہ تھے وہ کسی چیز کو خریدنے اور فروخت کرنے کی مجاز نہ تھی۔ عورت بیچی اور خریدی جاتی تھی اس کی حیثیت عین جانوروں کی تھی۔ جون اسٹوارٹ مل اپنی تصنیف ''محکومیت نسواں'' میں لکھتا ہے:

> ''باپ اپنی بیٹی کو جہاں چاہتا بیچ ڈالتا تھا۔ شادی ایک طرح تجارت تھی یعنی والدین اپنی لڑکیوں کو فروخت کرتے۔ وراثت میں خواتین کے حقوق نہایت محدود تھے کیوں کہ اس کی ہر چیز کا مالک شوہر ہوتا تھا۔ مرد جب چاہتا عورت کو چھوڑ دیتا۔ لیکن عورت کو طلاق یا خلع کی اجازت نہ تھی بیوی کی جائیداد کا بھی وہ حق دار سمجھا جاتا۔ اس کے علاوہ گرجا گھر میں نکاح کے وقت عورت کو تمام عمر شوہر کی اطاعت کا عہد لیا جاتا.....غرض پرانے زمانے میں یورپ کا قانون عورت کی حیثیت اتنی بھی باقی نہ رہنے دیا جو اکثر ممالک میں غلاموں کی

تھی۔''(مطالعات نسواں، ڈاکٹر آمنہ تحسین، ص30)

مصری سماج ومعاشرے میں عورت اپنے تمام حقوق پر فائز تھی۔اسے عزت واحترام وقدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔مصر کی عورتیں شہنشاہیت کا درجہ بھی حاصل کی ہوئی تھیں مگر ملکہ مصر عورتوں کے لباس میں نہیں بلکہ مردانہ لباس استعمال کرتی تھیں کیوں کہ مصریوں کا خیال تھا کہ عورت حکومت کی سرداری کی اہلیت نہیں رکھتیں۔

دھیرے دھیرے عورت کا یہ رتبہ ختم ہوگیا کیوں کہ وہاں بہت سے ایسے رسم ورواج تھے کہ عورت کو پستی کی طرف دھکیل دیا۔نکاح کے بعد عورت مرد کی ملکیت تصور کی جاتی۔شادی کے بعد عورت کا سارا مال مرد کے نام ہوجاتا حتیٰ کہ اولاد پر بھی عورت کو کوئی حق نہیں ہوتا تھا۔غرض کہ وہ مکمل طور پر غلام بنالی جاتی تھی۔ڈاکٹر محمد شہزاد شمس مصری عورت کی حیثیت کے بارے میں رقم طراز ہیں:

> ''فراعنہ مصر کے آخری زمانے میں جب عیش،خوشی اور آرام پسندی کا دور آیا تو تعداد ازدواج کا سلسلہ بہت بڑھ گیا اور عورتوں کو اپنے حقوق کی حفاظت کی فکر ہوئی تو انہوں نے شادی کے لیے مختلف شرطیں رکھیں۔یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ نکاح نامہ کی ایجاد سب سے پہلے قدیم مصر میں ہوئی۔اس سے قبل کسی بھی ملک میں شادی کے وقت شرطیں لکھ کر ان پر دستخط کرنے کا رواج نہیں ملتا ہے۔''(عورت اور سماج،شہزاد شمس،ص19)

مذہب اسلام کے ظہور سے قبل عرب سماج میں بھی عورت کی حیثیت اچھی نہ تھی۔لڑکی کی پیدائش کو عار سمجھا جاتا تھا عورت پوری طرح غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی تھیں۔لڑکی پیدا ہوتے ہی اسے قتل کردیا جاتا تھا یا پھر زندہ درگور کردیا جاتا تھا۔شادی کے بعد عورت مرد کی ملکیت تصور کی جاتی تھی۔ایک سے زیادہ کئی کئی بیویاں رکھنے کا رواج عام تھا۔عورت کو کرائے پر بھی دیا جاتا تھا۔شمیہ محسن اس سلسلے میں رقم طراز ہیں:

> ''دور جاہلیت میں عرب بیٹی کے پیدا ہونے کو باعث ننگ وعار سمجھتے تھے جب کسی کے ہاں بیٹی پیدا ہوتی تو وہ لوگوں سے چھپتا پھرتا اور جلد سے جلد اس سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کرتا۔اسی لیے لڑکی کو پیدا ہوتے ہی مٹی میں

دبا دیا جاتا۔اس ظلم پر اللہ تعالیٰ ظالموں سے ضرور سوال کرے گا کیوں کہ اللہ کی مخلوق کو حق زندگی سے محروم کرنے کا کسی کو حق نہیں ہے۔''(اردو ادب میں تانیثیت ،مشتاق وانی،ص35)

ملک چین میں بھی عورت کی حیثیت غلامانہ تھی۔وہاں بھی مرد ہی غالب سماج تھا۔عورت کو محض جذبات کی تسکین اور افزائش نسل کے لیے رکھا جاتا،لونڈیوں کو بھی رکھنے کا رواج تھا،لڑکیاں بیچی اور خریدی جاتی تھیں،ان کو تعلیم سے بھی دور رکھا جاتا تھا،کم سنی میں ان کی شادی کردی جاتی اور سسرال میں ان کی حیثیت محض ایک خادمہ کی سی ہوتی تھی اور بیوہ ہوجانے کی صورت میں دوسری شادی ممنوع تھی۔چینی معاشرے میں کم عمری ہی میں لڑکی کے پاؤں میں پیتل یا سخت دھات کے بنے ہوئے جوتے پہنا دیے جاتے تھے تاکہ پیر بڑھ نہ سکے کیوں کہ بڑی پیر والی لڑکی اس سماج میں بری نظر سے دیکھی جاتی۔یہ تکلیف دہ رواج اس سماج میں ایک عرصے تک رائج رہا۔

ملک چین میں کنفیوشش ایک مذہبی پیشوا تھا عورت کے متعلق اس کے نظریات سخت تھے۔اس کا حکم تھا کہ عورت قبل از شادی اپنے بھائی اور باپ کی فرمانبردار رہے اور بعد شادی اپنے شوہر اور بیٹے کی مطیع۔کنفیوشش کے اس نظریات نے عورت کو بہت ہی پست درجے تک پہنچا دیا تھا۔

چین کے جیسے ہی جاپان میں بھی عورت گھر کی چہار دیواری کے اندر مقید تھی،سیاسی وسماجی معاملات میں اس کا کوئی عمل دخل نہ تھا۔اس ملک میں لڑکی کی پرورش بڑے سختی سے کی جاتی،ہر طرح کی آزادی سے مفقود تھیں حتیٰ کہ بحالت نیند بھی اسے بالکل سمٹ کر سونا پڑتا تھا۔گھریلو معاملات میں انہیں ماہر بنا دیا جاتا وہیں لڑکے کو بلند ہمتی و بہادری کی تعلیم سے بہرہ ور کیا جاتا تھا،مردوں کے لیے طلاق بہت آسان کام تھا،لڑکیوں کو لباس اتنا تنگ پہنایا جاتا کہ اس کے ہاتھ کھل نہ سکیں ان کا نظریہ تھا کہ عورتوں کو مردوں کی طرح کا کام نہیں کرنا ہے اس لیے ہاتھوں کو کشادہ نہیں ہونا چاہیے۔جاپانیوں کا یقین تھا کہ مرنے کے بعد راحت کا انحصار اولاد نرینہ پر ہے اسی لیے لڑکے کی پیدائش کو ترجیح دی جاتی۔

سمیری تہذیب میں عورت کے ساتھ نہایت ظلم وستم اور تحقیر آمیز رویہ اختیار کیا جاتا تھا،کسی بھی جرم کی سزا میں مرد اپنی بیوی کو قتل کرسکتا تھا یا کسی بھی قرض کی ادائی گی میں اپنی بیوی کو باندیوں کی طرح فروخت کرسکتا تھا۔ان کا اخلاق اس قدر گھٹیا اور سوچ اتنی گھناؤنی تھی کہ مالی تنگ دستی کے وقت اپنی بیوی

اور بیٹیوں سے بدکاری بھی کرواتے تھے تا کہ مال کما سکیں۔ وہ اپنی لڑکیوں کو سال کسی مخصوص دن ایک جگہ پر اکٹھا کرتے جہاں ان کی نیلامی ہوتی اور لڑکیوں کو اس شرط پر بیچا جاتا کہ وہ مرد اس سے شادی کرے۔ شادی کے بعد گھریلو کام کا بوجھ عورت کے کاندھے پر لاد دیا جاتا اس طرح عورت کی حیات بیل کولہو کی طرح مرد اور گھریلو کاموں کے مابین گزر جاتی علاوہ ازیں بچہ پیدا کرنا، ان کی پرورش کرنا سب عورت کی ذمہ داری ہوتی۔

تاریخ کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ سمیریوں میں کسی لڑکی کو اس وقت تک شادی کی اجازت نہ تھی جب کہ وہ کسی اجنبی سے اپنا گوہر عصمت بدفعلی کے ذریعہ ختم نہ کرائے اور یہ عمل ایک مستقل عادت اور قانون بن چکا تھا اور ہر کنواری کو وہاں کے قانون کی پاسداری کرنی ہی ہوتی تھی۔ ایک مؤرخ اس تہذیب کا نقشہ یوں کھینچتے ہیں:

> ''ہر وہ عورت جو اس ملک میں جنم لیتی ہے اس کا مذہبی فریضہ ہے کہ وہ اپنی زندگی میں ایک مرتبہ مندر میں بیٹھ جائے، وہ اس وقت مندر سے نہیں جا سکتی تھی جب تک کہ کوئی غیر محرم مرد اس کو پسند کر کے اس کی گود میں چاندی کا سکہ نہ ڈال دے۔ اس سکہ کو پانے کے بعد وہ عورت قانوناً انکار نہیں کر سکتی تھی اور اسے لازمی طور پر مرد کیساتھ جانا پڑتا تھا جب مرد اس کو سرفراز کر چکتا تو وہ گھر لوٹتی تب اسے فخر کی چیز سمجھا جاتا تھا۔'' (اردو ادب میں تانیثیت، مشتاق وانی، ص 29)

دیگر ممالک کی طرح انگلستان میں بھی عورت کی حیثیت نہایت خستہ رہی۔ یہاں بھی شادی کے بعد عورت کی جائیداد، روپیہ، پیسہ سب مرد کی ملکیت تصور کی جاتی تھی اس کو یہ اختیار حاصل نہ تھا کہ وہ اپنی جائیداد یا پیسہ شوہر کی مرضی کے بغیر استعمال کر سکے۔ قدیم رسم کے مطابق مرد اپنی بیوی کو اس کے باپ سے خریدتا تھا اس لیے شوہر ہی اس کا مالک ہوتا تھا، ہر طرح سے عورت کا استحصال کیا جاتا اور عورت کو باندی بنا کر رکھا جاتا تھا۔

انگلستان کے پادریوں نے عورت کو مکر و فریب اور بہکانے والی کی حیثیت سے سماج کو متعارف کرایا جس کی وجہ سے عورت کی مخالف ذہنیت بنتی چلی گئی اور عورت وہاں کے معاشرے میں ایک حقیر ہستی بن کر رہ گئی۔ وہاں کے رسم کو آمنہ تحسین یوں لکھتی ہیں:

''انگلستان میں ایک قدیم رسم عرصے تک رائج تھی۔اس رسم میں سسر اپنی بیٹی کی شادی میں داماد کو ایک کوڑا تحفتاً دیتا تھا جو عورت کو مارنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔کوڑا لگانے کی رسم کو ۱۹۱۷ء میں ممنوع قرار دیا گیا۔''(مطالعات نسواں،ڈاکٹر آمنہ تحسین،ص35)

روس میں بھی دوسرے ممالک کی طرح عورت کی حیثیت ابتر تھی۔یہاں بھی شادی کے بعد عورت مرد کی ملکیت تصور کی جاتی۔روس میں بھی کوڑا لگانے کی رسم جاری تھی بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ کوڑا لگانے کی یہ رسم روس ہی کی ایجاد کردہ ہے اور یہ رسم زار کی سلطنت کے اخیر تک رائج رہی۔زار نے بیوی کو کوڑا لگانے اور زدوکوب کرنے کا ایک مفصل قانون بنایا تھا۔یہ رویت بھی مشہور ہے کہ فرصت کے لمحات میں روس کسان کا سب سے بڑا مشغلہ بیوی کو زدوکوب کرنا تھا۔روسی عورت پر محنت مزدوری کے علاوہ خانہ داری کے تمام امور کی ذمہ داری بھی تھی۔عورتوں کو تعلیم سے دور رکھا جاتا تھا محض سینے، پرونے اور چرخہ چلانے کی تعلیم دی جاتی تھی۔کم سنی کی شادی کا رواج تھا اور سخت پردے میں رکھا جاتا تھا۔

دنیا کی بیشتر زبانوں کے ادب کا جائزہ لینے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ عہد حاضر میں تانیثیت ہمارے تنقیدی مطالعے کا اہم جزو بن گئی ہے اور گزشتہ صدی سے یہ مطالعہ ایک تحریک کی شکل اختیار کر گیا ہے۔تانیثیت دور عصر کی ان قدروں کی آگہی کا نام ہے جو ہماری فکر کا حصہ نہیں بن سکی۔تاریخ شاہد ہے کہ تہذیب کے ہر دور کے ابتدا ہی سے عورت ہر میدان میں مردوں کی تابع رہی ہے اور ہر عہد میں مردوں نے محکوم بنا کے رکھا ہے یہی وجہ ہے کہ ہر دور میں عورت کی یہی تصویر دکھائی دیتی ہے جو ظلم و بربریت کے گھپ اندھیرے میں دفن ہے۔مگر افسوس کسی نے خواتین کے استحصال کے بارے میں سنجیدگی سے غور وخوض نہیں کیا خود عورت نے بھی نہیں بقول ڈوروتھی دزستین کہ'' مرد نے کبھی عورت کو انسان سمجھا ہی نہیں''

جب عورت ان بے جا بندشوں سے تنگ آ کر محکومی کی دلدل سے باہر آ کر اس تصویر کو دیکھتی ہے تو اس کے اندر اس تصویر کو بدلنے کا داعیہ پیدا ہوتا ہے اور عورت کا یہی احساس تانیثیت کے نام سے ہمارے سامنے آتا ہے۔عورت کی اسی کوشش کو موجودہ دور 'تحریک نسواں' کا نام دیتا ہے۔اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عورت نے سب سے پہلے بغاوت کب کی اس کے بارے میں مکمل فیصلہ نہیں کیا جا سکتا اس سلسلے میں

Ellen Key کا خیال ہے کہ نسائی تحریک کی شروعات حوّا کے شجرممنوعہ کی طرف ہاتھ بڑھانے سے ہوئی:

"....her will to pass beyond established bounds has constantly been the motive of her conscious as well as of her sub-conscious quest."

(فیمنیزم تاریخ وتنقید، شہناز نبی، ص31)

چنانچہ عورت کا اپنے مجوزہ حدود سے تجاوز کرنا ہی نسائی تحریک کی ابتدا ہے۔عورت نے اپنے ذاتی صفات کا اظہار ہر دور میں کیا۔کبھی اس کی حیثیت ایک حکمراں کی رہی تو کبھی ایک جاں باز سپاہی کے روپ میں ان کی ان صورتوں کو'مردانہ' کہہ کر سراہا گیا مگر ان کرداروں کو نباہتے وقت بھی وہ ایک عورت تھی محض۔عورت کا شجرممنوعہ کی طرف ہاتھ بڑھانا اس کی پہلی بغاوت تھی گرچہ یہ لاشعوری طور پر تھی۔

قدیم دور ہی سے عورتوں کی صلاحیت واستطاعت کے بارے میں مختلف فلسفیوں کی رائے کچھ اچھی نہ تھی۔ ارسطو (384-322ق۔م) جو کہ مشہور یونانی مفکر، منطقی اور سائنس داں گزرا ہے''سیاست'' کی پہلی جلد میں لکھتا ہے:

"For although there may be exceptions to the order of nature, the male is by nature fitter for command than the female, just as the elder and full-grown is superior to the younger and more immature."

(فیمنیزم تاریخ وتنقید، شہناز نبی، ص32)

قدیم تہذیب ومما لک اور مذاہب میں عورتوں کے متعلق منفرد خیالات ملتے ہیں۔کسی نے کہا کہ عورت سے بچ کر رہنا چاہیے کیوں کہ وہ برائی کی طرف راغب کرتی ہے، کسی نے اسے جادوگرنی وڈائن کہہ کر مخاطب کیا تو کسی نے اسے خدا کا بہترین تحفہ کہا ہے۔

جب تک مادری نظام قائم تھا عورت کی حیثیت معاشرے میں ارفع واعلیٰ تھی مگر جیسے ہی اس کا

خاتمہ ہوا عورت مرد غالب سماج معاشرہ میں عورت ظلم و بربریت کا شکار ہوتی رہی اور مختلف طریقے سے اس کا استحصال کیا جاتا رہا، جس کی وجہ سے عورت کے اندر بغاوت کا جذبہ انگڑائی لینے لگا اور اپنے حقوق کے تئیں احتجاج کرنے کرنے پر آمادہ ہوگئی۔

روسو جس کے خیالات نے فرانس میں انقلاب برپا کر دیا تھا وہ عورتوں کے تعلق سے مردوں کے وضع کردہ اصولوں کا حامی ہے وہ مرد کی بیوفائی کو جائز کہتا ہے اور عورتوں سے وفا کی پوری امید رکھتا ہے۔اس کے نزدیک عورت کی بیوفائی نا قابل معافی ہے۔ روسو عورتوں کو مردوں کے مساوی تعلیم دینے کے مخالف تھا۔اس کا ماننا تھا کہ مرد و عورت ایک جیسے نہیں ہیں اس لیے ان کی تعلیم بھی ایک جیسی نہیں ہونی چاہیے:

> "The moment it is demonstrated that man and woman are not and ought not to be constituted in the same way, either in character or in constitution, it follows that they ought not to have the same education."

(فیمنیزم تاریخ وتنقید، شہناز نبی، ص32)

جس معاشرے میں روسو جیسا فلاسفر عورتوں کو ان کے حقوق دینے کی بات نہیں سوچ سکتا وہاں عام لوگوں سے بھلا اس کی کیا امید کی جاسکتی ہے۔

تاریخ کا مطالعہ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ زمانۂ قدیم میں عورت کا وجود بہت شاندار رہا ہے وہ حاکم کی حیثیت سے زندگی گزار رہی تھی اور اسے قدر کی نگاہ سے بھی دیکھا جاتا تھا۔مختلف روایات، رسوم، مٹتے ہوئے نقوش وکھنڈرات اس بات کے گواہ ہیں کہ عورت کو دیوی بنا کر اس کی پوجا ارچنا کی جاتی تھی۔عورت کا یہ عظیم ماضی انیسویں صدی کے وسط تک قائم رہا۔باخوفن کی کتاب ''مادری حق'' (867)، مورگن کی تصنیف ''قدیم سماج'' (1877)، لی ٹیلر کی کتاب ''بنی نوع انسان کی ابتدائی تاریخ اور تہذیب کے ارتقا کی تحقیقات'' "Research into early history of Man Kind and the Developement of civilization" 1865، میکلینن کی تصنیف ''قدیم تاریخ کا

مطالعہ (1886)، زیراٹیولیون (Zeera Tuleun) کی کتاب ''خاندان کا آغاز'' (1874) اورفریڈرک اینگلس کی شاہکار تصنیف ''خاندان،ذاتی ملکیت اور ریاست کا آغاز''(1884) قابل ذکر ہیں۔

مذکورہ بالا فلاسفروں اور محققین نے بذریعہ تحقیق یہ ثابت کردیا کہ تہذیب وتمدن کے ارتقا میں عورت کا کردار اہم رہا ہے۔وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کچھ ایسے عوامل واسباب کی بنیادیں پڑیں جس کی بنا پر عورت کی حیثیت بد سے بدتر ہوتی چلی گئی۔

ہندوستان کا شمار دنیا کے قدیم ترین تہذیب یافتہ دیشوں میں ہوتا ہے جہاں دیوتاؤں کی ساتھ ساتھ دیویوں کی بھی پوجا کی جاتی تھی مگر عورت کے معاملے میں تنگ نظر واقع ہوا ہے۔ہندوستانی تاریخ میں کسی ایک دور میں عورت کی حیثیت اعلیٰ وارفع تھی اسے معاشرے میں عورت کے برابر تمام حقوق حاصل تھے۔تاریخ ہند میں قدیم وجدید دور کے مابین خواتین کے کردار اوران کی حیثیت میں عروج زوال کے نمایاں مرحلے نظر آتے ہیں۔چنانچہ ''اردھانگنی'' کا نظریہ بتاتا ہے کہ:

> ''ماضی میں مردوں اور عورتوں کے درمیان مساوات تھی۔دونوں میں کوئی بھی برتر نہیں تھا۔لیکن بعد میں بربریت کا دور شروع ہوا اور عورتوں کو ماتحت کا موقف دے دیا گیا اور انہیں کئی اعتبار سے محروم کردیا گیا۔اسے اپنے خاندان سے جس میں وہ پیدا ہوئی یا اس خاندان سے جس میں اس کی شادی ہوئی آزادی حاصل کرنے کا نہ تو قانونی حق حاصل رہا نہ سماجی اور نہ مذہبی۔''(مطالعات نسواں،ڈاکٹر آمنہ تحسین،ص37)

ویدک دور میں لڑکی کی بڑی قدر ومنزلت تھی۔رگ وید کے کسی بھی اشلوک میں بیٹی کی پیدائش کو نامبارک نہیں قرار دیا گیا۔ ویدک دور میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو چاند کی ۴/تاریخ کو کنیا شردھا کیا کرتے تھے جس کا مقصد قابل اور باصلاحیت بیٹیوں کے تحفے کا حصول ہوا کرتا تھا۔

ویدک دور میں جب آریہ برصغیر کی مختلف جگہوں پر آباد ہوکر خانہ بدوشی کی زندگی بسر کرنے لگے تو دھیرے دھیرے آریائی تہذیب وثقافت بھی پروان چڑھنے لگی۔وہ عورت کو کافی عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے نیز تعلیمی اعتبار سے عورت کو تمام سہولیات میسر تھیں۔سروانکر امنیکا کے مطابق:

''کم سے کم بیس عورتیں ایسی ہیں جنہیں رگ وید کے گیت لکھنے کا اعزاز حاصل ہے،ان میں سے کئی نامور شاعرہ بھی ہیں۔ان کی نظموں کو ویدک ادب میں شمولیت کا اعزاز حاصل ہوا۔'' (مطالعات نسواں، ڈاکٹر آمنہ تحسین،ص 37)

ڈاکٹر محمد شہزاد شمس اس تعلق سے لکھتے ہیں:

''ویدک عہد میں عورتوں کی تعلیم کا رواج تھا۔ان میں بعض شاعرہ،بعض فلسفی اور بعض استانی کی شکل میں ہمارے سامنے آتی ہیں۔اگر چہ تعلیمی، مذہبی اور سماجی ترقیوں کے درمیان کچھ دشواریاں ضرور حائل ہوئیں لیکن اس کے باوجود عورتوں نے تعلیم حاصل کی اور وقتاً فوقتاً اپنے علم اور اپنی اہلیت ولیاقت کا مظاہرہ کیا۔مذہبی تنظیموں اور اداروں میں پیش پیش رہنے کے ساتھ اجتماع میں بھی بھرپور حصہ لیا۔'' (عورت اور سماج،شہزاد شمس،ص 30)

اس دور میں لڑکیوں کی شادیاں بھی سمجھداری کی عمر ہونے کے بعد ہوا کرتی تھی جیسے 14 تا 17 سال کی عمر میں وہ بھی ان کی مرضی سے۔اگر کسی وجہ سے لڑکی غیر شادی شدہ رہ جاتی تو اسے باپ کی نگرانی میں اور باپ کے مرنے کے بعد بھائی کی حفاظت میں زندگی گزارنے کی توقع کی جاتی تھی۔

دھرم شاستر نے باعصمت بیوی کو دیوی کا درجہ عطا کیا تھا''پنچ تنتر''میں کہا گیا ہے کہ''گھر کی دیکھ بھال کا پتہ بیوی کی تہذیب سے چلتا ہے۔اس کے بغیر گھر ایک بھیانک جنگل کی طرح ہوتا ہے۔''اس دور میں بیواؤں کو دوبارہ شادی کی اجازت تھی مگر دوبارہ شادی کرنے والی عورت گرہنی (بیوی) کا مقام حاصل کرنے کی آرزو نہیں کرسکتی تھی،تاہم گھر کی دیکھ بھال کرنے والی بن سکتی تھی۔اتھروید میں بھی دوبارہ شادی کا ذکر ملتا ہے۔اس کے لیے پنربھا کا حوالہ ملتا ہے بمعنی دوبارہ شادی شدہ بیوہ کے مرحوم شوہر کے بھائی سے شادی عام بات تھی۔تقریباً 1500 ق۔م سے عورتوں کے موقف کے بارے میں نظریاتی تبدیلیاں آتی گئیں جس میں تعلیم کے حصول کی ممانعت کی گئی ہے۔رفتہ رفتہ 1500 ق۔م کے بعد کے تمام دور میں انحطاط کے آثار ملتے ہیں۔اپنشدوں اور برہمنوں کے دور میں عورتوں کی سماجی حیثیت میں زوال ہونا شروع ہوگیا۔لڑکیوں کو وہاں جانے کی اجازت نہ تھی جو تعلیم کا مبدا یا مرکز سمجھے جاتے تھے۔ان کا قریبی رشتہ داران کو تعلیم دے سکتا تھا مثلاً باپ، بھائی، چچا یا ماموں

وغیرہ ۔محض دولت مند اورتہذیب یافتہ خاندانوں کی لڑکیوں کو مذہبی ودیگر قسم کی تربیت حاصل ہوتی تھی۔اس طرح تعلیم صرف برہمنوں تک ہی محدود ہوکررہ گئی،بیٹوں کی خواہش بڑھی اور بیٹیاں بوجھ تصورکی جانے لگیں۔

برہمن اعلیٰ تھے اس لیے وہ دماغی کام کرتے تھے جب کہ شودرنیچ سمجھے جاتے تھے کیوں کہ وہ جسمانی محنت کرتے تھے،عورت اس لیے ناپاک تصورکی جاتی تھی کہ وہ پیداواری کے مراحل سے گزرتی تھی۔عورتوں کو نیچا دکھانے میں مردوں کی مصلحت پسندی کام کررہی تھی۔خاندان میں جائیداد کا بڑا حصہ لینے کے لیے وہ مشترکہ خاندان پرزوردیتا تھا۔اسی دورکا خیال تھا کہ ''بیوی ساتھی ہے،بیٹی پریشانی اور بیٹافردوس بریں کی روشنی۔''

جب سوتروں،سمرتیوں،پرانوں اوررزمیہ داستانوں مطلب رامائن اور مہابھارت کا عہدآیا توعورتوں کی حالت اور بھی ابتر ہوگئی۔اس پرتعلیم کے دروازے بند ہوگئے،وہ سراپافریبی ،ہوس پرستی،ناپاکی،جھوٹ اورکم فہمی کا جیتا جاگتانمونہ تصورکی جانے لگی۔یہ غیراخلاقی رویہ اس عہد میں منوسمرتی کے قانون کی وجہ سے لوگوں کے اندر پیدا ہوگیا۔منّو کے قائم کردہ اصول کے مطابق عورت بھلے ہی کسی طبقے سے تعلق رکھتی ہواسے شودر کے درجے میں رکھا گیا تھا۔اس طرح منّو نے عورت کی حیثیت کو بالکل ختم کرکے رکھ دیا۔اسے تمام شرکی جڑاورنفسانی خواہشات کی پجارن مانتے ہوئے لکھتا ہے:

> ''عورت دنیا میں مردکوورغلاتی ہے۔اس لیے کوئی بھی شخص اس کی صحبت میں رہ کر محفوظ نہیں رہ سکتا.....عورت کواپنے،بستر،گھر،زیورات،ناپاک خواہشات،غصہ، بے ایمانی،کینہ پروراور بداطواری سے ہی محبت ہوتی ہے۔اسی لیے عورتوں کو مقدس کتابیں پڑھنے کی اجازت نہیں ہے۔''(عورت اور سماج،ڈاکٹرشہزادشمس،ص،38)

مذکورہ اقتباس سے پتہ چلتا ہے کہ منّو نے عورتوں کے بارے میں جن خیالات کا اظہارکیا ہے وہ کافی حدتک توہین آمیز ہیں۔اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ منّو نے کس بنیاد پرعورت کے تئیں غیراخلاقی نظریہ قائم کیا؟ورنہ تو باعتبارنفسیاتی دیکھا جائے تو عورت بہت حساس اوررقیق القلب ہوتی ہے۔ڈاکٹرایم استھر ہارڈنگ کے قول کے مطابق:

''اگر مرد افسردہ ہے تو عورت پر بھی اداسی چھا جائی گی اگر وہ مسرور ہے تو عورت بھی مجسمہ بن جائے گی۔ مرد کے مزاج کی کیفیت محسوس کرنے کے سلسلے میں اس کا یہ لاشعوری وجدان اس قدر تیز ہوتا ہے کہ بعض اوقات جب کہ مرد کو اپنے حساسات کا خود صحیح اندازہ نہیں ہوتا۔عورت اسے محسوس کر لیتی ہے اور اس کا مزاجی ردعمل بالکل مرد کے احساسات کے مطابق ہونا چاہیے۔''(بحوالہ اردو ادب میں تانیثیت ،مشتاق وانی۔ص142)

میری ڈیلی نے اپنی تصنیف"The church and the second sex"1975ء اور وائٹ مارٹن نے "The Status of women in Pre-industrial Societies" 1978"میں عورتوں پر لگائی گئی پابندیوں کا ذکر تفصیلاً کیا ہے۔ مذہب کی آڑ میں مردوں نے عورتوں سے ان کے جائز حقوق بھی چھین لیے اور انہیں گھر میں قید کر دیا۔ کم عمری کی شادی کا رواج عام ہوتا گیا شادی کے ساتھ جہیز کی بھی مذموم رسم کا بڑھاوا ملتا رہا۔ جہیز نہ لانے کی وجہ سے عورتوں ذہنی وجسمانی اذیت پہنچائی جاتی حتیٰ کہ قتل کرنے سے بھی گریز نہ کیا گیا۔ بیواؤں کو دوبارہ شادی کرنا گناہ بتایا گیا اور اس طرح نہ جانے کتنی کم سن بیواؤں کو زندگی کے عیش سے محروم کر دیا گیا۔ بقول رومیلا تھاپر''ہندوستان میں ستی ہونے کا پہلا واقعہ 510ء میں ظہور پذیر ہوا۔''1830ء میں لندن کی Privy Council نے اس رسم پر پابندی لگائی گویا1320 / سال کے ایک طویل عرصہ تک عورتیں شوہر کی چتا کے ساتھ جلائی جاتی رہیں۔

ہندو دھرم کی مقدس کتابوں میں بھی وہ عزت واحترام نہیں دیا گیا جیسا کہ مردوں کو حاصل تھا۔ مہابھارت، رامائن اور پران جیسی مقدس کتابوں میں عورت کے متعلق اچھے خیالات نہیں ملتے یہاں بھی گنہگار اور نیچ دکھایا گیا ہے عورت کو اس لیے ہندو دھرم کی ان مقدس کتابوں کے تصورات نے عورت کی سماجی حیثیت کو بالکل پست کر دیا۔ اس دور میں غیر منصفانہ فضول رسم مثلاً کمسنی کی شادی، ستی اور ایک سے زائد بیویوں کے نظام نے عورتوں کا موقف کم کر کے اسے جیسے جانوروں کے موقف پر کر دیا۔ اسے''ناری شودر'' سمجھا جاتا تھا۔ مشہور چینی سیاح ہیون سانگ جس دور میں ہندوستان آیا اس وقت یہاں ستی کی رسم اپنے عروج پر تھی۔ اس سلسلے میں وہ اپنے مشاہدے کو یوں بیان کرتا ہے:

''اس نے کسی عورت کو دوسری شادی کرتے ہوئے نہیں دیکھا ستی کا رواج نہ

صرف زور پکڑ گیا تھا بلکہ اس کی قصیدہ خوانی بھی ہونے لگی تھی۔''(بحوالہ اردو ادب میں تانیثیت ،مشتاق وانی۔ص143)

ہندوستانی تاریخ میں ایک دور میں عورتیں کامیابی کے عروج پر پہنچ گئی تھیں انہوں نے زندگی کے تمام شعبوں میں مردوں کے ساتھ مل کر کام کیا بلکہ بعض معاملات میں ان سے آگے بھی نکل گئیں۔انہیں مکمل آزادی تھی۔اپنا فیصلہ خود لینے کا حق تھا مگر اچانک ایسی خود اعتماد عورتوں نے خود کو تنگ وتاریک چہار دیواری کے اندر مقید کر پایا ان کے بنیادی حقوق سلب کر لیے گئے،انصاف،مساوات اور تعلیم سے محروم کیا گیا اور گھریلو،سماجی،قانونی،معاشی،سیاسی غرض کہ ہر طریقے سے محروم کر دیا گیا۔انہیں ''گرہ پنجرہ کو کیلا''(گھر کے پنجرے کی کوئل) کا خطاب ملا اور بہت حقیر مقم تک پہنچا دیا گیا۔بچپن میں بیوہ ہوجانے والی لڑکیوں کی شادی کا رواج بھی ختم ہوگیا۔1000ء کے اوائل تک اونچے طبقے کی بیواؤں کو شادی کی اجازت نہیں تھی مگر جوں جوں وقت گزرتا گیا یہ رسم نچلے طبقے میں بھی کافی حد تک پہنچ گئی۔

گیارہویں صدی عیسویں کے بعد ہندوستانی عورتوں کے موقف میں کافی انحطاط پیدا ہوا۔اس عہد میں برے رواجوں مثلاً کمسنی کی شادی،سخت پردہ کا رواج،ستی،بیوگی،عصمت فروشی اور دیوداسی نظام کی وجہ سے عورتوں کو مصائب اور ظلم کا شکار ہونا پڑا۔ ہندو دور ہو یا مسلم دور عام عورت ہی مظلوم ومحکوم تھی۔امیر زادیاں ہی تعلیم حاصل کر سکتی تھیں۔باوجودیکہ مغل حکمرانوں میں ایسی کئی خواتین تھیں جنہوں نے اپنی علمی وسیاسی صلاحیتوں کا لوہا منوایا تھا مگر ان کے مغل حکمراں عام ہندوستانی خواتین کے مقام میں بہتری نہ لا سکے جب کہ مغل حکمران ایک ایسا مذہب لائے تھے جس نے عورت کو صدیوں کی پستی سے نکال کر معاشرے اور خاندان میں معتبر مقام عطا کیا تھا اور وہ تمام مساویانہ حقوق عورت کو دیے گئے تھے جو مرد کو حاصل تھے مگر ہوا یوں کہ دوسرے مذاہب کے اثرات نے مسلمانوں میں بھی مرد کے غلبہ نظام کو فروغ دیا۔نتیجہ یہ ہوا کہ عورتوں کے تمام حقوق پامال ہوگئے اور دوسرے مذاہب کے عورتوں کی طرح مسلم عورتیں بھی توہمات اور عقیدوں میں جکڑ گئی تھیں چنانچہ اس دور میں مسلموں اور ہندوؤں کے مابین تہذیب وثقافت اور رسم ورواج کے تبادلوں نے عورتوں کی حیثیت اور بھی کم تر کر دیا تھا اور مسلمانوں کی آمد کے بعد پردے کی روایت سخت پردہ کے نظام میں تبدیل ہوگئی۔بقول رومیلا تھاپر:

''ابتدائی صدیوں میں عزت دار گھروں کی خواتین پردہ کرنے لگی تھیں اور اسلام

میں رائج پردے نے تو عورت کی گوشہ نشینی کو اور بھی بڑھادیا تھا۔'' (بحوالہ مطالعات نسواں، ڈاکٹر آمنہ تحسین، ص 51)

مغل دور میں ہندو معاشرے میں بیٹی کا مقام بدترین درجہ کو پہنچ گیا تھا اس دور میں بیٹیوں کی شادیاں نو یا دس برس کی عمر میں کردی جاتی تھی۔ بعض دفعہ ایسا بھی ہوا کہ بات کرنا ابھی سیکھ بھی نہ پاتی تھیں کہ ان کی شادی کردی جاتی تھی۔ نیز انہیں ورثہ سے خارج کر کے مردوں پر منحصر کردیا گیا تھا، کم عمری کی شادی کی وجہ سے تعلیم کے سلسلہ میں کافی گراوٹ آئی۔ بیوہ کی دوسری شادی عام طور سے ممنوع تھی۔ الٹیکر کے مطابق:

''بیواؤں کی دوبارہ شادی پر امتناع تقریباً 1000ء سے نافذ ہوگیا تھا یہاں تک کہ بچپن میں بیوہ ہوجانے والوں کی بھی دوسری شادی ممنوع تھی۔ اس پر مکمل امتناع عائد تھا ہندو سماج میں تقریباً 1100ء سے ابتدا میں سماج کے بالائی ذاتوں کی بیواؤں کی دوبارہ شادی پر امتناع تھا جب کہ نچلی ذاتوں کی بیوائیں ایسا کرسکتی تھیں۔ آئندہ صدی سے نچلی ذاتیں سنسکرت تہذیب اختیار کرنے کی وجہ سے اور ان کے احترام میں اضافہ کی خواہش کی وجہ سے اپنے آپ پر بیواؤں کی دوبارہ شادی پر امتناع مسلط کرنا شروع کردیا۔'' (بحوالہ مطالعات نسواں، ڈاکٹر آمنہ تحسین، ص 52)

اسلام میں کسی مصلحت کے پیش نظر طلاق یا دوسری شادی کرنا معیوب نہیں تھا لیکن متوسط دور کے ہندو سماج میں طلاق اور دوسری شادی خواتین کے لیے ممنوع تھی۔ ہندو سماج کے زیر اثر مسلمانوں میں بھی شادی کو قطعی حیثیت حاصل تھی۔ بقول قرۃ العین حیدر:

''ہندوستانی والدین اپنی لڑکی کو نصیحت کرتے تھے کہ ایسے مجازی خدا (شوہر) کے گھر میں پالکی میں بیٹھ کر جاؤ کہ وہاں سے صرف جنازہ ہی باہر آئے۔ یہ خوش حال معمر خاندانوں کے لیے بھی ایک غیر تحریری قانون بن گیا۔'' (بحوالہ اردو ادب میں تانیثیت، مشتاق وانی، ص 147)

ہندوستانی معاشرے میں خواتین کی ذلت و گمراہی کا دور اس وقت زور پکڑتا گیا جب کہ

بادشاہوں اور نوابوں کی حرم سراؤں کی روایت نے عورت کی پوزیشن کو اور بھی ذلیل کر دیا نتیجتاً طوائف نے جنم لیا۔ کیوں کی عورت کا وجود محض لذت فراہم کرنے کا ایک ذریعہ بن کے رہ گیا اور اس صورت میں عورت ایک بازاری شے کی حیثیت اختیار کر گئی۔ اس دور میں قحبہ خانے کو فروغ اس قدر ملا کہ علاؤالدین خلجی نے اس سلسلے میں فرمان جاری کیا کہ:

> ''پردے کی سختی سے قحبہ خانوں میں تیزی آنے لگی۔ دہلی میں اس کی تعداد اتنی بڑھی اور سماج میں اس کے اثرات اتنے پھیلنے لگے کہ علاؤالدین خلجی نے اس کے متعلق خصوصی فرمان جاری کیا کہ اسے جلد سے جلد قابو میں لایا جائے اور جہاں تک ممکن ہو، ان کی شادی کرا کر خانگی زندگی گزارنے کے لیے مجبور کیا جائے۔'' (عورت اور سماج، ڈاکٹر شہزاد شمس، ص 52)

ہندوستان میں مسلمانوں کے دور حکومت میں لڑکیوں کی شادی بچپن میں ہی کر دی جاتی تھی۔ البیرونی کے مطابق گارہویں صدی عیسوی میں ایک برہمن لڑکی کی شادی ۱۲/ سال کی عمر میں کر دی جاتی تھی۔ ستی کی رسم نے بھی کم عمری کی شادی کو عام کیا۔ دور متوسط میں مغل شہنشاہ اکبر نے بچپن کی شادی پر روک لگائی تھی۔ آئین اکبری کے مطابق لڑکی کے بالغ ہونے کے بعد ہی اس کی شادی کی جا سکتی تھی۔ اس کے باجود ہندوستان میں نو یا دس سال کی عمر میں شادی کا رواج ملتا ہے۔''

اس دور میں کئی مسلم بادشاہوں نے ستی کی رسم کو توڑنے کی کوششیں کیں مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ اس طرح عورتوں کی ماتحتی انیسویں صدی کے آغاز تک برقرار رہی۔ جب انگریز ہندوستان آئے تو انہوں نے عورتوں کی زندگی میں کچھ تبدیلیاں لائیں۔ عورتوں کی آزادی اور تعلیم کا تصور بھی انیسویں صدی کی دین ہے۔

ہندوستان میں انگریزی بغرض تجارت آئے تھے اور 1608ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی قائم کی۔ 1757ء میں ہندوستان کی کچھ ریاستوں پر قابض ہو گئے۔ بعد ازاں ان کی پالیسیوں میں تبدیلی آئی۔ 1784ء میں Pitts India Bill پاس ہوا جس کی رو سے کمپنی کی تاجرانہ پالیسی اور سیاسی پالیسی الگ الگ تیار ہوئی تو انگریز کو ہند پر اپنا قبضہ بڑھانے کا شوق پیدا ہوا۔ جس سے ہندوستان کی معیشت پر برا اثر پڑا اور ہندوستان کی عورتیں بھی اس کی لپیٹ میں آ گئیں۔ اس طرح پورا

ہندوستان1823ء تک برطانوی سامراج کے چنگل میں رہا۔جب مکمل طور پر قابض ہوگئے تو اپنی سہولیات کے لیے سڑکیں اور ریلوے کا نظم کیا اس سے نوآبادیاتی نظام کو فروغ ملا۔انگریزی تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا۔کرشچین مشنریوں اور برطانوی حکمرانوں نے ہندوستان میں عورتوں کی تعلیم کا نظم کیا پھر1929ء میں انہوں نے بچپن کی شادی پر امتناع کا قانون Child Marriage Restraint Act منظور کیا۔اس قانون سے کمسنی کی شادی اور لڑکپن میں بیوہ ہوجانے والی خواتین میں بہت کمی ہوئی۔ اس قانون کے تحت لڑکیوں کی شادی کی عمر14 برس مقرر کی گئی۔14 سال سے کم عمر کی لڑکیوں اور18 سال سے کم عمر کے لڑکوں کی شادی پر جرمانہ تجویز کیا گیا۔1929ء میں بچپن کی شادی پر امتناع کا قانون ''شارڈا'' کا قانون کہلایا۔

1857ء میں آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کی شکست کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کا خاتمہ ہوگیا اور1858ء کا انڈیا ایکٹ پاس ہوا جس کی وجہ سے پورے ہندوستان پر برطانیہ کا تسلط قائم ہوگیا۔اس نئے نظام سے ہندوستان کی غریب عورتیں کافی متاثر ہوئیں،بدیس مال ہندوستان پہنچنے لگا اور لگان کا نیا قانون لگ گیا۔

جہاں تک عورتوں کی آزدای کا تعلق ہے تو ہندوستان میں عورتوں کی آزادی کا تصور انیسویں صدی سے پہلے نہیں ملتا۔گرچہ راجہ رام موہن اور ودیاساگر جیسے روشن خیال لوگوں نے معاشرے میں بہت ساری تبدیلیاں لائیں۔انیسویں صدی کے اخیر تک انگریزی تعلیم کے واضح اثرات بنگال پر نظر آنے لگے۔بہت جلد انگلستان میں تعلیم حاصل کرنے والوں کا بوژوا طبقہ بھی ابھر گیا۔کلکتہ کے علمی وادبی حلقوں میں فرد،سماج،قومیت جیسے موضوعات پر مباحثے ہوا کرتے تھے۔نشاۃ الثانیہ کے نتیجے میں مغرب میں برابری،انصاف وغیرہ جیسے موضوعات پر خیالات کیے جارہے تھے ان ہی خیالات نے مغرب میں Feminism کی بنیاد ڈالی تھی اور ہندوستان میں بھی عورتوں کی زبوں حالی پر غور کرتے ہوئے Feminism کی تحریک آگے بڑھی۔

کچھ انگریز افسران اور تعلیم یافتہ ہندوستانی شرفا نے بھی خواتین کے مسائل پر غوروخوض کرنا شروع کردیا ان لوگوں نے بچیوں کے پیدا ہونے یا پیدا ہونے کے بعد جان سے مار ڈالنے کے عمل کو غیر انسانی رویہ بتایا اور اس کے خلاف لکھنا شروع کردیا۔کم عمری کی شادی،بیواؤں کا حال زار اور ستی

جیسی بری رسم کے تعلق سے انہوں نے کبیدگی کا احساس دلایا۔

بنگال میں راجہ رام موہن رائے نے ہندو مذہب کے رسم ورواج پر کڑی تنقید کی۔ان کے علاوہ ایشور چندودیاساگر جیسے سماج میں بہتری لانے کے لیے ان مذہبی روایات کے خلاف آواز اٹھائی جن کا بدلنا آسان کام نہ تھا۔انہوں نے ستی کی رسم کو ختم کرنے کے لیے آواز اٹھائی بلکہ انہوں نے جائیداد میں عورت کو حق دینے کے لیے بھی آواز اٹھائی۔1830ء میں راجہ رام موہن رائے نے ایک کتاب لکھی "Abstract of the Arguments regarding the Burning of the Widows Considered as a Religious Rite" جس کا مقصد ان غلط فہمیوں کو دور کرنا تھا جو مذہب کے نام پر قائم تھیں۔اس کتاب میں ستی کی رسم کے خلاف ان کے نظریات کھل کر ملتے ہیں۔ان کا خیال تھا کہ عورت کے ستی ہونے کا براہ راست تعلق مذہب سے ہے۔انہوں نے 1829ء میں ایک پٹیشن داخل کر کے ستی کو مجرمانہ عمل کہا۔ایشور چندودیاساگر نے بھی عورتوں کی حالت سدھارنے کے لیے کارہائے نمایاں انجام دیے،انہوں نے بیواؤں کی دوسری شادی پر زور دیا۔انہوں نے "Marriage of Hindu Widows 1855" میں اس بات پر زور دیا کہ اگرچہ ہندو میں بیواؤں کی دوسری شادی کا رواج نہیں ہے تاہم اس کی شروعات کی جاسکتی ہے''پارسراسمہیتا'' کے حوالے سے ودیاساگر نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ہندوؤں میں بیواؤں کی دوسری شادی کی ممانعت نہیں ہے۔اس بحث کو آگے بڑھاتے ہوئے ودیاساگر نے ایک پمفلٹ چھاپا جس میں ہندو بیواؤں کی پرزور حمایت تھی۔انہوں نے کہا کہ مرد اپنی طاقت کے گمان میں خود کے لیے سارے حقوق جائز سمجھتا ہے اور عورتوں کو کمزور سمجھ کر انہیں ان کے حقوق سے محروم رکھتا ہے۔بالآخر جولائی 1856ء میں بیواؤں کی دوسری شادی کا قانون پاس ہوگیا اور عورتوں کی خوش حال زندگی کے امکانات روشن ہوگئے۔عوامی وویکانند اور سوامی دیانند سرسوتی نے ویدوں کا حوالہ دیتے ہوئے عورتوں کی تعلیم پر زور دیا اور لوگوں کو یہ احساس دلایا کہ ویدوں نے عورتوں کو تعلیم حاصل کرنے کی اجازت دی ہے۔

حکومت کی ان کارروائیوں کے علاوہ 1917ء میں مسز اینی بیسنٹ نے ''انڈین ایسوسی ایشن'' کے ذریعہ خواتین کی تعلیم کو فروغ دینے کی کوشش کی۔1920ء میں ''فیڈریشن آف یونیورسٹی آف

ویمن'' قائم ہوئی اور 1925ء میں ''قومی کونسل برائے خواتین'' کا آغاز ہوا۔راجہ رام موہن رائے بانی برہموسماج، ایشور چندر ودیاساگر بانی آریہ سماج، دیانند سرسوتی، کیشب چندرسین، گوپال کرشن گوکھلے، راما کرشنا، پرم ہنس، سوامی وویکانند، پیرام جی ملباری، پنڈت رمابائی، شیخ عبداللہ، سجادحیدر یلدرم اور دیگر عظیم شخصیتوں نے مل کرعورتوں کے تعلق سے بے مثال بیداری پیدا کرنے کی کوشش کی جو کہ بچھڑی ہوئی اور صدیوں سے ظلم و جبر کی شکار تھیں۔

اگر دیکھا جائے تو برطانوی دور میں ہندوستان کی خواتین کے خاندانی، سماجی اور قانونی موقف کافی حد تک بہتر ہوئی مگران اقدامات کا فائدہ ایک چھوٹے حصہ نے ہی اٹھایا۔اس کے علاوہ ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں مہاتما گاندھی، سروجنی نائیڈو، وجے لکشمی پنڈت اور کستور باگاندھی کی قیادت میں ہزاروں ہندو مسلمان عورتوں نے حصہ لیا۔

عورتوں کی آزادی، حق رائے دہی، حق تعلیم، حق روزگار وغیرہ پر دنیا کے تقریباً تمام ملکوں میں بیک وقت غوروخوض کیا جارہا تھا اور احتجاج بھی ہورہے تھے مگران احتجاج پر کوئی دھیان نہیں دیا گیا۔برطانیہ میں جب میری والسٹون کرافٹ نے تحریری طور پر احتجاج کیا تو اس کا اثر ہوا۔Diane Scott Lewis کا کہنا ہے کہ حقوق نسواں کے لیے سب سے پہلے Mary Astell نے آواز بلند کی۔وہ انسائیکلوپیڈیا آف ورلڈ بایوگرافی کے حوالے سے لکھتی ہیں کہ Mery کی آواز سترہویں صدی میں بلند ہوئی۔

اردو ادب کی مختلف اصناف کا تاریخی جائزہ لینے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ عورت ہمیشہ سے ہی ادب کا ایک خاص موضوع رہی ہے۔داستانوں، کہانیوں اور افسانوں اور ناولوں میں عورت اور اس کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو الگ الگ زاویوں سے پیش کیا جاتا رہا ہے۔حتی کہ شاعری میں بھی شعرا کا مخصوص موضوع عورت ہی رہا ہے اور اس کے حسن و ادا و شباب سے اور اس کے زلفوں کی پیچ وخم سے شعرا حضرات اپنی شاعری کے خدوخال سنوارتے رہے بلکہ پورے کے پورے دیوان سجاڈالے، اس وقت بھی وہ گوشت کی بنی ہوئی اسی دنیا کی مخلوق تھی مگر اسے جب چاہے جہاں چاہے اور جیسے چاہے ویسے استعمال کیا گیا۔اس عمل کے دوران اس کے جذبات واحساسات کو اہمیت دینا تو دور کی بات اسے ایک سرے سے نظرانداز ہی کردیا گیا۔بقول باقر مہدی:

''غزل کی مکمل حکمرانی نے عورتوں پر تغزل کے دروازے اس طرح بند کیے تھے کہ
جان غزل تو بن سکتی تھی مگر خود غزل گو نہیں۔'' (بحوالہ اردو ناولوں میں نسائی
حسیت، ڈاکٹر حمیرہ سعید، ص36)

پدرسری معاشرے نے کبھی عورت کے بارے میں سوچا ہی نہیں کہ وہ کس طرح محسوس کرتی تھی ؟ کیا سوچتی اور کیا سمجھتی تھی، اس کے دکھ، سکھ کیسے تھے؟ اسے کبھی سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی گئی اور اگر کوشش ہوئی بھی تو پہلے اسے حقیر سمجھا گیا کہ اس میں خرابی ہے اور اسے اصلاح کی ضرورت ہے۔ یعنی پہلے تو عورت کی حیثیت محض ضرورت تک محدود تھی۔ وہ ایک ایسی ہستی تھی جو خدمت اور تسکین کے لیے بنائی گئی تھی۔ اس کی زندگی کا ایک ہی مقصد تھا کہ بچہ پیدا کرے، مرد کا دل بہلائے اور مرد کے ساتھ ستی ہو جائے، معاشرے میں اس کی کوئی حیثیت نہ تھی۔ عورت کی یہ حالت تھی کہ وہ اپنے اوپر ہونے والے تمام ظلم وستم کو اپنا تقدیر سمجھنے پر مجبور تھی۔

ایک عرصے تک عورتوں پر اپنا تسلط جمانے کے بعد مردوں کو یہ احساس ہوا کہ عورت بھی ایک انسان ہے، اسے بھی سماجی مساوات کا حق ملنا چاہیے۔ خود عورتوں کے اندر بھی یہ احساس جاگا کہ مرد سماج ان کے احساسات وجذبات کو کچل رہا ہے انہیں بھی آزادی ملنی چاہیے۔ جب یہ احساس جاگا تو اس کا ردعمل مختلف صورتوں میں ہوا، اس ردعمل کے طور پر جو تحریک چلائی گئی اسے نسائی تحریک کا نام ملا، جس کے ذریعہ عورتوں پر کیے گئے مظالم کے خلاف آواز اٹھائی جانے لگی۔

سولہویں صدی تک خواتین مکمل طور پر مرد کے اختیار میں رہیں، تاریخی مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ صدیوں سے تقریباً ننانوے فیصد عورتیں اپنی حیثیت پر بنا کسی گلے شکوے کے صابر وشاکر رہیں۔ سترہویں صدی میں بعض خواتین نے اپنی برادری کے لیے جدوجہد کرنا شروع کر دیا اور بات پر زور دیا کہ عورت محض شے نہیں بلکہ جذبات واحساسات رکھنے والا جیتا جاگتا وجود ہے جو صرف دوسروں کی مرضی سے زندگی گزارنے کے لیے پیدا نہیں ہوئیں بلکہ اپنی مرضی کے مطابق زندگی گزارنے کا حق رکھتی ہیں مگر مردوں نے عورتوں کو محض کٹھ پتلی کی طرح دیکھنا چاہا تو عورتوں نے باقاعدہ طور پر اس کی مخالفت کی اور اس نظریات کی وضاحت شروع کر دی کہ مرد وزن باعتبار حقوق سب برابر ہیں۔ خواتین کے حقوق کے بارے میں آوازیں بلند ہونا اٹھارویں صدی کے وسط ہی سے شروع

ہوگئی تھیں۔ جب چند خواتین دانشوروں نے ملتجیانہ انداز میں معاشرے میں خواتین کو درپیش مسائل کے بارے میں چرچ کی توجہ مبذول کرتے ہوئے ان سے مداخلت کی درخواست کی تھی۔ یہ درخواست ایک لمبے خط کی شکل میں کی گئی تھی مگر اس کا کوئی معقول نتیجہ سامنے نہیں آیا۔اس کے بعد میری والسٹون کرافٹ(1759-1797) جوکہ میری شیلی کی ماں تھی،کا نام سرفہرست ہے،ان کی تصنیف "A Vindication of the Rights of Women 1792" شائع ہوئی۔ یہ تصنیف مردوزن کے مساوی حقوق پر اصرار کرتی ہے۔کرافٹ مردوں کی بالادستی کے تصور کو غیر فطری قرار دیتی ہیں۔مغربی تانیثی نقطۂ نظر سے یہ احتجاج کی پہلی معتبر آواز ہے۔اس کتاب کو کرافٹ نے ایڈمنڈ برک کی تصنیف "A Vindication of the Right of Men 1790 کے جواب میں لکھی تھی۔

برک نے اپنی کتاب میں عورتوں پر مردوں کی بالادستی کے طریقے کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش کی تھی مگر کرافٹ نے اس سے انکار کردیا کہ عورت محض عیش پرستی کی شے ہے اور عوتوں کے ساتھ روا رکھنے والے جنسی وصنفی تفریق کو بھی غیر فطری اور معاشرے کی دین بتایا ہے،حقوق کے ضمن میں کرافٹ نے لکھا ہے کہ مردوعورت پر بغیر کسی تخصیص کے یکساں طور پر لاگو کیے جائی۔پہلی مرتبہ کسی عورت نے اپنے تشخص کے لیے آواز اٹھائی،مرد غالب سماج میں عورت کی طرف سے احتجاج کا یہ پہلا قدم تھا جس نے مرد اساس معاشرے پر کاری ضرب لگائی۔ پھر رفتہ رفتہ تانیثی تحریک کے نقوش بننے لگے۔

خواتین کے مسائل ایک مؤثر آواز کی شکل میں امریکہ میں 1848ء میں سینیکا فالز(Seneca Falls) میں ابھر کر سامنے آئے۔ یہاں خواتین کی پہلی کانفرنس منعقد ہوئی۔اس کے بعد دوسرا مؤثر کنونشن اوہیو (O h i o) میں منعقد ہوا جس میں ایک خواتین مقرر سوجورنر ٹروتھ (Sojourner Truth) کی تقریر کا یہ مختصر اقتباس:

> "Than that little man in black there he say women can't have as much rights as man, because Christ was'nt a women! Where did your Chirst come from! From God and a Women! Man had nothing to do with him."

(کالے کپڑوں میں ملبوس وہ پستہ قد آدمی کہتا ہے کہ عورتوں کو مردوں کے
برابر حقوق کیسے مل سکتے ہیں، کیوں کہ حضرت عیسیٰؑ عورت نہیں تھے۔ میں پوچھتی
ہوں کہ حضرت عیسیٰؑ کہاں سے آئے تھے؟ کہاں سے! اللہ اور ایک خاتون کی
طرف سے۔ ان کے ظہور میں مرد کا کوئی دخل نہیں تھا۔)

(خواتین اردو ادب میں تانیثی رجحان، ترنم ریاض، ص 31)

ابتدا میں خواتین کے حقوق کی بحالی کی تحریک، مغرب کی پوری سماجی، اصلاحی تحریک (Movement for Social Reform) کا ایک حصہ تھی۔ جس کا بنیادی مقصد غلامی کا خاتمہ (Abolition of Slavery) تھا، مگر پھر خواتین رہنماؤں کو اس بات کا احساس ہوا کہ اپنے حقوق کی دریافت کے لیے انہیں اپنی ایک الگ تنظیم بنانی ہوگی۔ لہذا انہوں نے اپنی مخصوص تنظیم قائم کر کے اپنے حقوق کی جدوجہد کا باقاعدہ طور پر آغاز کیا۔ انہوں نے نابالغ بچوں کی سرپرستی کے حقوق، جائیداد میں اپنا معقول حصہ، طلاق کے معاملات کی وضاحت، اعلیٰ تعلیم، بالخصوص طبعی شعبے میں داخلے اور مردوں کے برابر اجرت کی مانگ کی۔ ان سب سے اہم ان کے حق رائے دہی (Right of Vote) کی مانگ کی تھی، جو انہوں نے سونیکا فالز میں 1848ء میں کی تھی۔ حق رائے دہی کی لڑائی انہوں نے سینیکا فالز کے ستر سال بعد جیتی اور 1928ء میں ان کو یہ حق حاصل ہو گیا۔

خواتین کے حقوق کی بحالی، ان کے سماجی منصب کا تعین اور ان کی انفرادیت کو تسلیم کرنے کی تحریک (جو کہ بعد میں تانیثیت کی صورت اختیار کر گئی) کی سیاسی، نظریاتی اور فلسفیانہ بنیاد (Basis) ایک ٹھوس صورت میں جان اسٹوارٹ مل نے فراہم کی۔ The Subjection of Women 1929 (محکومیِ نسواں) چار ابواب پر مشتمل ہے۔ ان کا جامع اور مدلل مضمون خواتین کے حقوق کی بازیافت، عورت کی شناخت، اس کے سیاسی و سماجی مرتبے، اس کے استحصال اور جبر و استبداد کے حوالے سے حرف اول ہے۔

مل نے عورت کی محکومی و محرومی کا معاملہ ایک وکیل کی طرح سماجی عدلیہ میں اپنے منطقی دلائل کے ساتھ پیش کیا۔ مل کی دلیلیں، باریکیاں اور تشریحات سے متاثر ہو کر سیمون دی بوار (Simone de Beauvir) گرمین گریئر (Germaine Greer) اور جوڈتھ بٹلر (Judith Butler) نے

تخلیقی محرکات ااور تانیثی تھیوریاں تشکیل دیں۔مل کا بنیادی نکتہ یہ تھا کہ مردوں کی دلیل یہ ہے کہ خواتین حاکمیت کی اہل نہیں ہیں،اس لیے ان کی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ ان کی خامیوں کی نشاندہی کریں جس کی بنا پر خواتین کو حکومت(Governence) کے لیے نااہل قرار دیا گیا۔مل نے تاریخی، سائنسی اور منطقی دلائل سے یہ ثابت کر دیا کہ خواتین ذہانت اور دماغی صلاحیتوں کے معاملے میں مردوں سے کسی قدر کم نہیں ہیں۔مل نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ:

"The inequality of rights between men and women has no other source than the law of might"

(خواتین اردو ادب میں تانیثی رجحان،ترنم ریاض،ص32)

کیا مردوں اور عورتوں کے مساوی حقوق،ان کا مساوی،سماجی،سیاسی اور معاشی درجہ غیر فطری ہے؟اس کا جواب مل نے یوں دیا کہ دنیا کی ہر بالا دستی(Domination) کو فطری بنا کر پیش کیا گیا ہے۔یہاں تک کہ ارسطو نے بھی کالوں پر گوروں کی بالادستی کو فطری بنا کر پیش کیا ہے۔مل کا خیال ہے کہ مردوں نے نظام تعلیم کو بھی کچھ اس طرح سے وضع کیا ہے کہ عورتوں کے ذہن پر اس کا اثر ان ہی کی مرضی کے مطابق ہو۔بقول مل:

Men do not want solely the obedience of women, they want their sentiments: All men.....not a forced slave but a willing one, not a slave merely but a favourite."

(خواتین اردو ادب میں تانیثی رجحان،ترنم ریاض،ص33)

جان اسٹوارٹ مل کے یہ دلائل کافی حد تک تانیثی فلسفے اور تھیوری کی بنیاد بن گئے۔

سیاسی،سماجی اور معاشی اعتبار سے دوسری جنگ عظیم تاریخ کا ایک اہم موڑ تھی۔اس جنگ کے بعد صنعتی انقلاب کے زیر سایہ سیاسی اور سماجی اقدار کا از سرے نو جائزہ شروع ہوا۔سٹیریوٹائپ (Stero Type) کو چیلنج کیا جانے لگا۔خواتین کی ایک اچھی تعداد روزگار کے مارکیٹ میں داخل ہوگئی۔خواتین کی

بہت سی انجمنیں اور تنظیمیں بنیں۔ یورپ اور امریکہ میں تو ان تنظیموں کا جال بچھ گیا۔اب خواتین تنظیموں نے مملکت سے یہ مطالبہ کیا کہ رفاہی نظام حکومت (Welfare State) کے اصولوں کے تحت مملکت کو خواتین کو خانگی ذمہ داریوں میں سے کچھ بوجھ اپنے ذمہ لینا چاہیے۔مغرب میں خواتین کے حقوق کی بحالی کی تحریک کے ساتھ کچھ خواتین ادبی سطح پر بھی ابھریں۔انیسویں صدی کے چوتھے دہے میں خواتین قلم کار ادبی منظرنامے پر آتو گئی تھیں مگر اکثر وبیشتر وہ مردوں کے قلمی نام سے ہی لکھتی تھیں۔یہ دور تقریباً چار پانچ دہائیوں تک جاری رہا۔اس تحریک کے حامیوں اور خیر کواہوں میں کئی ادیب بھی تھے۔1908ء میں سیمی ہیملٹن نے "Women's Writers sufferage leauge" قائم کی۔جس کے اراکین میں صحافی، ڈرامہ نگار اور کئی دانشور تھے،ان ادیبوں اور صحافیوں نے خواتین کے مسائل کو اپنا موضوع بنایا۔اس ضمن میں ورجینا وولف کی Night and days، ایچ جی ویلر کی Ann Veronice اور برناڈ شاہ کی تصنیف Presscutlings نے اہم کردار ادا کیا۔پین کھرسٹ اور ای پیتھک لارنس نے نسائی تحریک اور اس کے مطالبات، مقاصد اور اقدامات پر کئی مضامین لکھے۔اس دور میں The Common Votes for Women Cause, Women's sufferage journal dreadnought جیسے جرائد بھی منظر عام پر آئے اور ان تصانیف، رسائل وجرائد نے ایک مناسب فضا تیار کی۔مرد اور خواتین ادیبوں نے اس فضا کی تیاری میں اہم رول ادا کیا ہے۔ورجینا وولف کی تصنیف "ARoom of one's Own 1929" اور سیمون دی بوار کی کتاب "The Second Sex 1949" (انگریزی ترجمہ ۱۹۷۱ء) نے صنفی استحصال اور عورتوں پر ہورہی ناانافیوں کی طرف توجہ دلائی۔ان کے نزدیک عورت مرد سے کسی قدر کم نہیں، ان کی صلاحیتوں کو نظر انداز کیا گیا، اسس لیے ان پر نظر ثانی کرنے کی بہت ضرورت ہے۔ان کی اس کوشش سے نسائی تحریک کو ایک نئی راہ مل گئی۔اس سلسلے میں جتنی تصنیفات ہیں ان میں میری ایلی مان کی Thinking about women 1968، کے ملیٹ کی Sexual Politics 1969، بیٹی فرائڈن کی The feminine my stique 1963، ادافیگر کی Partriarchal attitudes 1970، ایلزبتھ ہارڈونک کی Seducation and Betray 1974، ایلین موٹرز کی Literary Women 1976، ایلین شووالٹر کی Literature of their

The mad women in the attic 1978 (ان کا اپنا ادب) اور سنیڈرا گلبرٹ اور سوزان گیوبر کی own شامل ہیں۔

مغربی ادب ہندوستانی ادب سے بہت پرانا ہے اور دائرہ بھی بہت وسیع ہے۔مغربی زبانوں میں عورت پر بہت کچھ لکھا گیا پھر جب نسائی تحریک کی شکل اختیار کر گیا تو اس پر بھی خوب لکھا گیا مگر اس تحریک کے لکھاریوں میں دو قسم کے لوگ ملتے ہیں، ایک تو وہ جو عورتوں کی آزادی اور حقوق و مساوات کی آواز اٹھاتے ہیں اور دوسرے وہ ادیب (خواتین) جو دوسرے مرد کے ساتھ رشتہ رکھنے ہی کو غلط قرار دیتے ہیں۔اعتدال پسند نسائی تحریک کے ماننے والوں کا خیال تھا کہ عورت کا درجہ مرد کے مقابلے کم تر بنایا گیا ہے۔عورت و مرد دونوں مل کر طاقت ور ہو جاتے ہیں۔ان لوگوں کا ماننا ہے کہ قدرت نے عورت کو زندگی خوبصورت بنانے کے لیے پیدا کیا ہے، لیکن عورت کا کام محض جسمانی تقاضوں کو پورا کرنا نہیں ہے بلکہ وہ بھی آزادانہ زندگی گزار سکتی ہیں، عورت بھی مرد کی طرح انسان ہے، اس لیے مرد کی طرح عورت کو بھی اپنی مرضی سے پسند و ناپسند کا حق ہے۔

غرض کہ اعتدال پسند تحریک کے حامی عورت کو مرد کے ساتھ ساتھ کچھ مخصوص حدود کے اندر آزادی دینے کے خواہاں ہیں ان میں جان اسٹوارٹ مل اور گاندھی جی وغیرہ کے نام آتے ہیں۔Friedmen کا کہنا ہے کہ:

> ''عورت کو زندگی کے چیلنج کا سامنا نہیں کرنا چاہیے بلکہ وہ بطور بیوی اور ماں اپنی خودداری اور عزت نفس کا پاس رکھنا چاہیے جو عورتیں ایسا نہیں کرتیں وہ زندگی کی مسرتوں کو حاصل نہیں کر سکتیں اور خود کو قصوروار ٹھہراتی ہیں نہ کہ حالات کو۔'' بحوالہ اردو ناولوں میں نسائی حسیت، ڈاکٹر حمیرہ سعید، ص 42

انتہا پسند تحریک کے حامیوں میں بھی دو طرح کے رجحانات نظر آتے ہیں۔ایک تو عورت کو مرد کے بالکل برابر درجہ دینا چاہتے ہیں اور دوسرے حامیوں کا کہنا ہے کہ عورت مرد سے بہتر اور اعلیٰ ہے، کچھ تو مرد کے ساتھ رشتہ توڑنے ہی کو اس کا حل بتاتے ہیں۔ایشلے موٹیج Ashley Moutague کا کہنا ہے:

> ''عورت کی ماں بننے والی صلاحیت سے مرد حسد کرنے لگا کیوں کہ بچے کو جنم

دینا ایک عظیم تخلیقی عمل ہے اسی حسد کے زیر اثر مرد نے عورت کو احساس کمتری میں مبتلا کرنا شروع کر دیا۔'' (بحوالہ اردو ناولوں میں نسائی حسیت، ڈاکٹر حمیرہ سعید، ص 42)

اس تحریک کا اہم مقصد عورت کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں اور عدم مساوات کو ختم کر دیا اگر عورت کو حاکم نہ سمجھا جائے تو کوئی بات نہیں محکوم بھی نہیں سمجھنا چاہیے بلکہ انسان سمجھنا چاہیے۔ لہذا مغرب کے زیر اثر ہندوستانی ادب میں خاطر خواہ تبدیلیاں آئیں اور ادب پر ان تبدیلیوں کا واضح اثر دیکھنے کو ملا، جب یورپ میں عورت کی حیثیت و مرتبہ کے لیے آواز اٹھائی جانے لگی تو کچھ عرصے بعد اس کا اثر ہندوستان میں نظر آنے لگا۔

انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے آغاز میں ہندوستان کے حالات دگر گوں تھے، مختلف تحریکیں چل رہی تھیں، ہندوستان کی معاشرتی، سماجی، تہذیبی زندگی میں بدلاؤ آنے لگا تھا، پرانے اقدار اور رواج کی جگہ نئے رجحانات نے لے لی اور ہندوستان کو پسماندگی سے نکالنے کے لیے اصلاحی تحریکیں شروع کی گئیں، ان تحریکوں کو پروان چڑھانے میں ادب نے کارہائے نمایاں انجام دیا ہے۔ سماج کی اصلاح کے لیے ادب کا سہارا لیا گیا چونکہ ادب اپنے سماج کا آئین ہے۔ جب عالمی سطح پر عورتوں کے حقوق، مساوات اور آزادی پر آواز اٹھائی گئی تو اس کا اثر عالمی ادب پر بھی پڑا نیز اردو ادب پر بھی یہ رجحان غالب رہا۔

اردو ادب میں تو باقاعدہ طور پر کوئی نسائی تحریک نہیں ملتی مگر اس تحریک کے عناصر اردو ادب پر ضرور حاوی رہے۔ اردو ادب میں خواتین کے ادب جس میں خواتین کے سماجی مسائل، موضوعات کی شکل میں ہمارے سامنے آتے ہیں ان کی شروعات انیسویں صدی کے اختتامیہ سے ہوتی ہے۔ اردو میں باضابطہ طور پر کوئی نسائی تحریک تو نہیں ملتی البتہ اس تحریک کے عناصر اردو ادب پر ضرور غالب رہے۔ اس حقیقت سے انکار کی کوئی گنجائش نہیں کہ خواتین کے مسائل اور ان کے حقوق پر مبنی ڈیڑھ صدی کی یہ لڑائی خواتین کے قلم سے نہیں بلکہ مرد دانشوروں کے قلم سے ہی شروع ہوئی۔ ڈپٹی نذیر احمد، خواجہ الطاف حسین حالی، سرسید احمد خاں، عبدالحلیم شرر، علامہ راشد الخیری، پنڈت رتن ناتھ سرشار، سیماب اکبرآبادی اور مرزا رسوا وغیرہ جیسے حساس فنکار ہی تھے جنہوں نے اپنی پوری ذمہ داری ایمان داری کے ساتھ

نبھائی۔جب نذیراحمد نے ناول نگاری کا آغاز کیا تو انہوں نے اپنے ناولوں میں ان سماجی برائیوں کو نمایاں کیا جن سے خواتین متاثر تھیں انہوں نے ناول کے ذریعہ عورت کا مثالی کردار بنا کر ان کی تربیت کرنی چاہی۔ان کا خیال تھا کہ عورتوں کو تعلیم سے دور رکھ کر ان کے ساتھ سخت ناانصافی کی جارہی ہے۔اس لیے انہوں نے عورتوں کی تعلیم کا بیڑہ اٹھایا ان کی نظر میں مرد وزن یکساں ہیں،انہوں نے نسائی کرداروں کو پیش کیا جو اپنی علمیت،سلیقہ مندی اور فہم کے ذریعہ اپنی زندگی خوشگوار بناتے ہیں، نیز عورتوں کے مسائل کو بھی پیش کیا،ان کے کرداروں میں تانیثیت جھلکتی ہے۔نذیراحمد اور ان کی بعد کی ادیباؤں کے نزدیک مسلم خواتین کا مسئلہ نہایت اہم تھا۔نذیراحمد کے بعد حالی کا نام آتا ہے۔انہوں نے سب سے پہلے عورتوں کی تعلیم کا نظم کیا اور اپنے وطن پانی پت میں لڑکیوں کا اسکول بھی قائم کیا ان لوگوں نے سب سے پہلے تعلیم نسواں پر زور دیا پھر مساوی حقوق،رفتہ رفتہ بدلتے بدلتے اس لڑائی نے بہت سارے مثبت روپ اختیار کر لیے۔

عبدالحلیم شرر نے زیادہ تر تاریخی ناول لکھے جن میں عورتوں کے فعال کردار کو پیش کیا ہے، یہ عورتیں بہادر بھی ہیں اور مردوں کے ساتھ میدان جنگ یا دوسری مہموں میں شریک کار ہیں،اس کے علاوہ انہوں نے معاشرتی ناول میں بھی عورتوں کی معاشرے میں کم تر حیثیت کو اپنا موضوع بنایا،بغیر مرضی کی شادی کی بھی سخت مخالفت کی۔

سرشار نے بھی اپنے ناولوں میں عورتوں کی تعلیم کی حمایت کی ،عورتوں کی آزادی اور ملک میں چلنے والی تحریک نسواں کا بھی بڑھ چڑھ کر خیر مقدم کیا ہے۔

اس کے بعد بیسویں صدی کی پہلی دہائی سے کچھ اہم ادیبائیں ملک کی تحریک آزادی کے ساتھ جڑ گئیں اور ہندوستان کی سماجی صورت حال اور اس میں عورت کی مظلوم شخصیت کو تبدیل کرنے کا بیڑہ اٹھایا۔عورتوں کی بڑی تعداد جیسے اکبری بیگم،محمدی بیگم،محمدی بیگم، نذر سجاد حیدر، صالحہ عابد حسین، مینہ خاتون،طیبہ بیگم،اختر النسا،صغریٰ ہمایوں مرزا،رشیدۃ النسا وغیرہ نے ناول نگاری اور افسانہ نگاری کی داغ بیل ڈالی۔نذر سجاد کے ان کے ناول ''آہ مظلوماں'' 1913ء میں ایک سے زیادہ شادی سے پیدا شدہ مسائل کا بے باکی سے ذکر کیا گیا۔ظاہر ہے یہ موضوع مسلم خواتین کے لیے خاصا متنازعہ فیہ رہا،اس کے علاوہ کئی مسلم خواتین انجمنیں بھی قائم ہوئیں،جن کے ساتھ کئی مشہور ادیبائیں وابستہ تھیں۔طیبہ بیگم نے

انجمن خواتین اسلام کی بنیاد ڈالی اور صغریٰ ہمایوں مرزا اس کی جنرل سکریٹری مقرر ہوئیں۔صغریٰ ہمایوں مرزا کے ناول ''موہنی'' کے چار ایڈیشن شائع ہوئے۔عورتوں کے طلاق کے مسائل، بیواؤں کی دوبارہ شادی اور خواتین کی اپنی پسند کی شادی کے حق کے سلسلے سے متعلق اس سماجی ماحول کے لحاظ سے ایک بے باک تجربہ ہے۔ اس دور میں مشرقی روایات اوراسلامی پردے کے ساتھ مخلوط تعلیم پر بھی زور دیا گیا اور کہا گیا کہ مسلم عورتیں پردے کے ساتھ اپنے باہر کے کام بھی انجام دے سکتی ہیں۔ یہاں تک کہ انہوں نے اسکول وکالج کی تعلیم، سیاست اور تحریک نسواں میں بھی مردوں کے ساتھ حصہ لیا۔

مرزا رسوا، قاضی سجاد حسین، قاضی سرفراز حسین اور قاضی عبدالغفار نے طوائف کی زندگی کو ہمدردی کے ساتھ پیش کیا اور یہ بتایا کہ عورت بذات خود طوائف نہیں بنتی بلکہ سماج اس کو طوائف بننے پر مجبور کرتا ہے اور پھر اس سے نفرت کرتا ہے۔علامہ راشدالخیری نے سماج کی دبی کچلی اور مصیبت زدہ عورتوں کا نقشہ کھینچا ہے اور عورتوں کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کو دردناک انداز میں پیش کیا ہے۔ اردوادب کی تاریخ میں پریم چند کا نام بھی اہمیت کا حامل ہے۔انہوں نے ہندوستان کی عام عورتوں کی زندگی کے ہر پہلو کو اپنے ناولوں اور افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ان کے ناول نگاری کی ابتدا بیوہ سے ہوئی۔جس میں انہوں نے ہندو بیوہ کے مسئلے کو اٹھایا۔طوائف کی بے جوڑ شادی اور بے مرضی کی شادی کی سخت مخالفت کی۔پریم چند کے آخری دور میں ترقی پسند تحریک کی ابتدا ہوئی اوراس تحریک کے زیراثر عورتوں کے مساویانہ حقوق پر زیادہ زور دیا جانے لگا اوراس کے روایتی تصور میں تبدیلی آئی اور شعوری طور پر اس کے مسائل یا زندگی کی دوڑ میں اس کے برابر ہونے کا احساس ہونے لگا۔اس کے بعد کے ادب میں عورت کو اعلیٰ تعلیم یافتہ اور برسرروزگار بھی دکھایا گیا اور جدوجہد آزادی میں اسے کامریڈ کا درجہ ملا۔یہ سلسلہ اس کے بعد بھی رہا، اب بھی جاری ہے۔

اردوادب میں تانیثی رجحانات کی جھلک بیسویں صدی کی چوتھی دہائی سے نظر آتی ہے۔یہ رجحان دوطرح کے تھے۔ایک رجحان خالص تانیثی شعور اور دوسرا تانیثی لب ولہجہ۔اس دور کا اہم نام ڈاکٹر رشید جہاں کا ہے، رشید جہاں نے 1930ء کے آس پاس لکھنا شروع کیا۔اردوادب میں تانیثیت کی روایت کا باضابطہ آغاز 1932ء یعنی انگارے کی اشاعت ہی کو مانا جاتا ہے۔گرچہ مندرجہ بالا مصلحین ومفکرین اور خواتین ناول نگاروں نے عورتوں کے ساتھ امتیازی رویہ، ان پر ظلم واستحصال یا ان کی

کمزوریوں اور مجبوریوں کو جس طرح ادب کا موضوع بنایا گیا اس سے انکار کی گنجائش نہیں لیکن آج تانیثیت جن معانی ومفاہیم سے گزر رہی ہے اس سے یہ دانشور کوسوں دور تھے۔تانیثیت کے ابتدائی نقوش ہمیں سب سے پہلے جس خاتون کے ہاں نظر آتا ہے وہ معتبر نام رشید جہاں کا ہے، جنہوں نے حکومت کی ان تمام حد بندی کو توڑتے ہوئے روایت سے بغاوت کیا۔ڈاکٹر رشید جہاں کی پرورش و پرداخت خالص تعلیم وتحریک نسواں کے ماحول میں ہوئی اور وہ نہایت ذہین اور روشن خیال تھیں۔انہوں نے طالب علمی ہی کے دور سے عورتوں کی مظلومیت اور ان کی کربناک زندگی کے خلاف لکھنا شروع کر دیا تھا ان کے افسانوی مجموعے ''انگارے'' جو کہ لکھنؤ سے شائع ہوئے ان کی دو کہانیاں ''دلی کی سیر'' اور ''پردے کے پیچھے'' کے بارے میں کافی باتیں ہوئیں، ان کو گمنام اور دھمکی بھرے خطوط بھی ملے۔رشید جہاں اشتراکی تھیں اور کمیونسٹ پارٹی سے وابستہ تھیں۔ان کی کہانیوں میں سماج میں مردوں وار عورتوں کے لیے مروجہ دو الگ الگ معیاروں اور اخلاقی اصولوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔''مجرم کون'' 1941ء میں ایک انگریزی جج مسٹر رابنس ایک گڈریے کو ایک مزدور کی بیوی بھگا لے جانے کے الزام میں تین سال کی سزا دیتا ہے حالانکہ وہ اپنی مرضی سے اس کے ساتھ گئی ہوئی تھی اور خود ایک کرنل کی بیوی کو بھگا کر اس کے شوہر سے طلاق دلوا کر شادی کر لیتا ہے۔قمر رئیس لکھتے ہیں:

> ''اب تک اردو افسانے میں جو ناگفتنی تھی گھریلو بول چال کی اس زبان کے سہارے رشید جہاں نے اسے گفتنی بنا دیا۔اس کے فن کا کمال اس میں ہے کہ قاری کو احساس بھی نہیں ہوتا کہ افسانوں کے ذریعہ پردوں کے اندر رہنے والی ایک ایسی محدود دنیا کی وسعتوں کی سیر کر رہا ہے جس سے اردو افسانے کا دامن تقریباً خالی ہے۔بعد میں اسی روایت کو عصمت چغتائی، خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور، صدیقہ بیگم، رضیہ سجاد ظہیر اور دوسری افسانہ نگار خاتون نے آگے بڑھایا۔لیکن اس میدان میں رشید جہاں بہرحال ان کی پیش رو کہی جائیں گی۔'' (بحوالہ تحریک نسواں اور اردو ادب، علی احمد فاطمی، ص 57)

خواتین اردو ادب میں رشید جہاں کے بعد تانیثیت کی سب سے واضح آواز عصمت چغتائی کی ہے۔ان کا انداز تحریر، لب ولہجہ اور آہنگ خالص تانیثی ہے۔ان کے یہاں حقیقت نگاری ہے۔خواتین

اردوادب میں ان کی تحریریں، تانیثی حسیت (Sensibility) اور تانیثی شعور (Conciousness) کے اظہار کا پہلا تجربہ ہیں، عصمت کے موضوعات ہر ایک سے الگ ہیں، سماجی حالات پر ان کا ردعمل بھی منفرد ہے۔ ان کے لہجے کی روانی میں تصنع، بناوٹ اور سجاوٹ بالکل بھی نہیں ہے بلکہ ہر چیز فطری محسوس ہوتی ہے۔ عورت کے جذبات، کیفیات، عورت کی سماجی حالات کی عکس بندی ان کا نفسیاتی ردعمل ایک نیا تجربہ ہیں۔ عصمت کے بعد قرۃ العین حیدر، جمیلہ ہاشمی، رضیہ فصیح احمد، خدیجہ مستور، جیلانی بانو، بانو قدسیہ، صغریٰ مہدی اور دیگر خواتین بھی اپنی تخلیقات کے ذریعہ ہم عصر معاشرہ، پدرانہ سماج اور ان کے رویوں، اقدار اور نظریات کے خلاف احتجاج کیا۔ ذکیہ مشہدی کے ہاں بھی اشاروں کنایوں والی بات نہیں ہے۔ نفسیاتی موضوعات ہو یا عورت کی مجبوریوں، لاچاریوں، سیاسی، سماجی، اور اقتصادی حیثیت کو بڑی بے باکی سے اجاگر کرتی ہیں۔ ان کا افسانہ ''افعی'' بابری مسجد کے انہدام اور ملک میں فرقہ پرست سیاسی قوتوں کی بالادستی اور ملک کے لیے اس کے مہلک اور دوررس اثرات کا ایک غیر جانب دارانہ جائزہ ہے۔ ان لوگوں کے نسوانی کردار سماج، مذہب اور مردوں کے استحصال کو خاموشی سے برداشت نہیں کرتیں بلکہ تیکھا سماجی شعور رکھتی ہیں اور اپنے حقوق کو پہچانتی ہیں۔ بقول عتیق اللہ:

> ''اردوادب میں پہلی بار رشید جہاں اور ان کے بعد عصمت چغتائی اور عصمت کے بعد سیدہ حنا تک بے شمار فکشن نگار خواتین ہیں جنہوں نے عورت کے وجود، اس کی حسیت، اس کی ذہنی ونفسیاتی پیچیدگیوں اور مطالبوں نیز خاموشیوں کو قوت گویائی عطا کی ہے۔ اب وہ پروفیشنل ہیں مردوں کے درمیان مردوں کی مکاریوں اور سازشوں سے آگاہ ذمہ دار اور فہیم اس کی اپنی رائے ہے۔ نظریہ ہے تصور ہے، یہ لے جدید شاعرات کے یہاں بھی پوری شدت کے ساتھ کارفرما ہے۔ کہیں پست کہیں بلند کہیں خفیف اور کہیں محیط۔'' (خواتین کی نظموں میں فکر کے اسالیب، عتیق اللہ، ص 56)

رضیہ سجاد ظہیر نے بھی اپنی بیداری فکر کو اپنی تحریروں کے ذریعہ قوت گویائی عطا کی ان کے ناولوں کی فضا، ماحول، موضوع، مواد اور کردار وزندگی کے بارے میں ان کا نقطۂ نظر دیگر خواتین ناول نگاروں سے قدرے مختلف ہے۔

ترقی پسند ادیبوں میں منٹو، بیدی، کرشن چندر وغیرہ ایک خاص مقام رکھتے ہیں، ان ادیبوں نے بھی عورت کے بڑے جاندار توانا اور متحرک روپ پیش کر کے سماج کے بدنما چہرے کو سامنے لانے کی سعی کی ہے۔

ایسے موضوعات جو پہلے ادیباؤں کے لیے ایک چیلنج تھے بلکہ ان پر لکھنا مشکل تھا مگر ان موضوعات پر لکھ کر یہ ادیبائیں اس حصار سے باہر آ گئیں اس طرح واجدہ تبسم نے شہر حیدرآباد کے جاگیردارانی نظام میں حویلیوں اور کوٹھیوں میں زندگی گزارنے والی ماماؤں اور خادماؤں کے جنسی استحصال کو اپنا موضوع بنایا ہے جو کہ ان کے مالکوں کے ہاتھوں ہوتا رہتا ہے۔ ان کے افسانے اور ناول ایک مخصوص تہذیبی اور معاشرتی پس منظر میں لکھے گئے ہیں۔ زبان و بیان اور موضوعات کے اعتبار سے تانیثی رجحان کا ایک نمونہ ہیں۔ معاشرے میں دبی کچلی اور پسی ہوئی عورتوں کا ردعمل ''اترن'' میں صاف جھلکتا ہے۔ ان کے علاوہ اردو ادب میں اور بھی ادیباؤں کی تخلیقات ہیں جن کے یہاں تانیثی رجحانات واضح طور پر نمایاں نہیں مگر تانیثی لب ولہجہ ضرور ملتا ہے۔ ان میں چند اہم نام خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور، ممتاز شیریں، جیلانی بانو، بانو قدسیہ، فرخندہ لودھی، رضیہ فصیح احمد، زاہدہ حنا اور صغریٰ مہدی وغیرہ ہیں۔

بیدی نے اپنے افسانوں میں عورت کو مرکزی حیثیت دی، اس کے درد دکھ، محرومیوں، ان کی آرزوؤں اور تمناؤں کو اپنے افسانے کا محور بنایا۔ ان کی کہانی ''لاجونتی''، ''اپنے دکھ مجھے دے دو''، ''ایک چادر میلی سی''، ''متھن'' اور ''گرہن'' ان تمام کہانیوں میں بیدی نے عورت کی نفسیات اس کے درد و کرب کو بڑے ہی فنکارانہ اور مخلصانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ اسی طرح کرشن چندر کا قلم بھی عورت کے ذکر پر ہمدردی اور دکھ میں ڈوب جاتا ہے۔ ان کے افسانوں کی ہیروئن ظالم سماج کے ظلم کو برداشت کرتے کرتے اپنی ہی آگ میں جل کر مر جاتی ہے۔

منٹو نے خواتین کے ان مسائل کو اپنے افسانے میں جگہ دی جسے معاشرہ بری نظر سے دیکھتا تھا اور دھتکارتا تھا۔ منٹو نے معاشرے میں پنپنے والی ان تمام سچائیوں کو سامنے لایا ہے کہ طوائف کا ذمہ دار خود معاشرہ اور معاشرے کے باعزت لوگ ہیں جو کہ کوٹھوں پر جانا پسند کرتے ہیں مگر طوائف کو سماج میں عزت دینے کی بات آتی ہے تو انگلی اٹھاتے ہیں۔ مہدی صدیقی کے خیال کے مطابق:

''منٹو کو احساس نہ تھا کہ انھوں نے کوئی فحش چیز لکھی ہے۔انھوں نے تو بس ایک افسانہ لکھا تھا۔انھوں نے مجھے بتایا کہ وہ افسانہ بڑی حد تک واقعات پر مبنی ہے۔وہ کہتے رہے کہ اگر یہ افسانہ فحش ہے تو وہ کیا کریں وہ واقعہ ہی فحش تھا۔آج کل کی سوسائٹی خود فحش ہے وہ صرف عکاس ہیں۔'' (مجموعہ لذت سنگ،ص104)

رضیہ فصیح احمد نے بھی مردانی بالادستی کو طنز کا نشانہ بنایا ہے جو کہ عورتوں کو ایک کنویں کا مینڈک سمجھتے ہیں۔''جب پھوپھی کھو گئی تھی'' ان کا اہم کارنامہ ہے۔اس کہانی میں انھوں نے یہ بتایا ہے کہ قدیم زمانے میں بوڑھی یا ادھیڑ اور جاہل باپردہ عورتوں کو مال واسباب کی طرح بے جان چیز سمجھا جاتا تھا۔

جمیلہ ہاشمی کے افسانوں کی عورت زندگی میں اپنا سب کچھ لٹ جانے کے بعد تلخ ماضی کے سہارے زندگی گزارنے پر مجبور نظر آتی ہے۔قرۃ العین حیدر کے اکثر ناولوں اور افسانوں کا موضوع عورت ہی ہے۔کچھ تو عورت کی دائمی مجبوریاں ہیں اور کچھ تو معاشرے کی پیدا کی ہوئی ہیں۔بقول مصنفہ:

''ازل سے اب تھ عورت ہی وہ مخلوق ہے جس کی قسمت میں ساری بدنصیبیاں لکھی ہوئی ہیں۔یہ وعرت ہی ہے جو ساری عمر مرد کی مختلف قسموں سے محبت کرنے کے بعد بھی ٹھکرادی جاتی ہے۔کبھی مرد اسے شوہر کے روپ میں ٹھکرا دیتا ہے،کبھی بیٹا ماں کے روپ میں محبوب محبوبہ کے روپ میں لیکن عورت اس کے باوجود ان تمام مختلف رویوں سے بے انتہا پیار کرتی ہے۔یہ عورت ہی ہے جو اپنی بے چارگی اپنی مجبوریوں اور مایوسیوں کا رونا رونے کے لیے گرجاؤں،مندروں،تیرتھ استھانوں،درگاہوں اور مزاروں میں جاتی ہے۔اور اپنی بے بسی کا شکوہ کرتی ہے۔'' (یادوں کے دھنک جلے،قرۃ العین حیدر،ص136)

''اگلے جنم موہے بٹیا نہ کیجیو''،''سیتاہرن''،''ہاؤسنگ سوسائٹی''،''چائے کے باغ''،''دل ربا''،''یادوں کی ایک دھنک جلے''،''جلاوطن''،''آسمان بھی ہے ستم ایجاد کیا''،''پت جھڑ کی آواز'' وغیرہ جیسے فسانوں اور ناولٹ میں بھی عورت کی محرومی اور بے بسی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔مگر قرۃ العین حیدر اپنے کرداروں کو قسمت اور مقدر کے سہارے جینے کے بجائے گھٹی فضا سے نجات دلانا چاہتی ہیں،وہ خواتین

زندگی کے تمام شعبے میں ترقی کے منازل طے کرتے ہوئے دیکھنا چاہتی ہیں،انہوں نے اپنے فکشن میں ایک آزادانہ،خوشی ومسرت سے بھرپور زندگی دینے کی سعی کی ہے۔

یہ تخلیقی صلاحیتوں کا مظاہرہ محض نثری ادب تک محدود رہا۔شاعری کے میدان میں بہت بعد میں خواتین آگے آئیں۔ایسااس لیے ہوا کہ باعزت گھرانے میں خواتین کا شاعری کرنا بہت ہی حقارت خیز سمجھا جاتا تھا۔اوراگر کچھ خواتین اس میدان میں آگے بڑھیں بھی تو اپنے اصلی ناموں کے بجائے مدانہ قلمی ناموں سے اظہار کرنا پڑا۔قمر جہاں اس بارے میں یوں لکھتی ہیں:

> ''بیسویں صدی کے اوائل میں کوئی شاعرہ کا نام نہیں ملتا ہے۔کچھ کے نام اورنمونے''بہارستان نازمولف حکیم فصیح الدین رنج میرٹھی۱۸۶۴) تذکرۃالنسا،چمن انداز(درگا پرشادنادر۱۸۷۸)وغیرہ تذکروں میں موجود ہیں مگر تفصیل اورحوالے کے بغیر۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خواتین جوشریف گھر کی بہوبیٹیاں تھیں،قدرت خداوندی سے اگر شعرگوئی کا ذوق بھی رکھتی ہوں گی تواس کی تشہیر سے ڈرتی تھیں،ایک خوف،ایک حجاب تھا جوانھیں ہزار پردوں کے پیچھے گھٹن کی زندگی گزارنے پرمجبور بنائے ہوئے تھا۔بالخصوص شعروشاعری کوخواتین کے لیے ایک عیب تصور کیا جاتا تھا۔ہمارے نزدیک اس کا جواز یہ ہے کہ چوں کہ اس فن کا تعلق بالعموم کوٹھے والیوں سے تھا۔لہذا محل کے اندر شہزادیوں اوررئیس زادیوں کے درمیان اس ذوق کا پایا جانا معیوب نگاہوں سے دیکھا جاتا تھالیکن عہدحاضر میں شعر گوئی کا مذاق ڈرائنگ روم کی زینت بن چکا ہےتو اکثر شریف زادیاں اس فن میں اپنی مہارت دکھانے میں کوشاں ہیں۔''(بیسویں صدی میں خواتین کی اردو شاعری،ڈاکٹر قمر جہاں،ص209)

خواتین میں کچھ شاعرات بڑی اہمیت کی حامل رہی ہیں جیسے کہ اداجعفری،شفیق فاطمہ شعریٰ،فہمیدہ ریاض،پروین شاکر،کشورناہید،ساجد ہزیدی،زاہد ہزیدی،زہرہنگار،نورجہاں،ثروت پروین،فناسید،رفیعہ،شبنم عابدی،بلقیس،ظفیرالحسن،شاہدحسن،عذراپروین،شائستہ حبیب،عذراعباس،

شہناز نبی،سارا شگفتہ، حمیرا ریاض، شبنم عشائی،رشیدہ عیاں،ترنم ریاض،عشرت آفرین وغیرہ۔ان شاعرات نے اپنی شاعری کے ذریعہ مرد اساس معاشرے سے بغاوت کا اعلان کر دیا۔

غرض کہ بیسویں صدی کی چھٹی دہائی کے بعد خواتین اردو ادب میں تانیثی رجحانات بالکل واضح طور پر ابھر کر سامنے آ گئے ہیں اس ادب میں نسائی شناخت کے نقوش دکھائی دینے لگے ہیں،ان ادیباؤں کے تجربات،ردعمل اور نفسیات نئے لب و لہجے اور اسلوب میں ہمارے سامنے آ رہے ہیں اب کوئی بھی موضوع شجر ممنوعہ نہیں رہ گیا۔ویسے تو تانیثی زبان،اسلوب اور جملوں کی ساخت کا آغاز تو رشید جہاں اور عصمت کے دور ہی سے ہو گیا تھا۔قرۃ العین حیدر نے سماجیاتی،ثقافتی اور فلسفی پس منظر میں اپنی تخلیقات رقم کیں۔ساجدہ زیدی، زاہدہ زیدی اور شفیق فاطمہ شعریٰ وغیرہ نے فلسفیانہ موضوعات کو اپنایا ہے،ان کی تخلیقات سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے اندر خود بینی اور جہاں بینی کا نیا انداز موجود ہے۔انہوں نے شجر ممنوعہ کو بھی ہاتھ لگایا اور لکشمن ریکھائیں بھی پار کیں۔

☆☆☆